Rgd.L.No.7243 Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1979

اس پرچہ میں :-

دین اور مذہب کی کشمکش

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک - -/۳ پونڈ	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۲	جون ۱۹۷۹ء	شمارہ ۶

فہرست

۱۔ لمعات - - - - - - (مملکت اسلامی کب بنتی ہے) - - - - - - - - - - ۲

۲۔ سونے کے زیورات کی شرعی حیثیت - - - - - - - (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) - - - - - - ۱۲

۳۔ باب المراسلات - ۱۴

(۱) فیصل ایوارڈ اور مودودی صاحب

(۲) انتخابات اور جماعتِ اسلامی

(۳) قرآنِ کریم اور معاشرتی مسائل۔

۴۔ احتساب ... (قسط ۱) - - - - - - - - - - - - - - - - ۲۵

۵۔ دین اور مذہب کی کش مکش - - - - - - - - - (محترم پرویز صاحب) - - - - ۳۳

(تاریخ انسانیت کا اہم ترین باب)

۶۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک - - - - - - - - - - - - - - - - - ۵۹

۷۔ ضرورتِ رشتہ - - - - - - - (۲) قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ - - - - - - - ۶۳

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر: شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ: علمی پرنٹنگ پریس، ۷ اسپتال روڈ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

(مملکت اسلامی کب بنتی ہے)

ہم شروع سے مسلمانوں کی مملکت اور اسلامی مملکت میں فرق کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اسلامی مملکت کے سلسلہ میں جو سوالات سامنے لائے جاتے ہیں اور اس کی جو تفصیلات ہم سے پوچھی جاتی ہیں ان کا تعلق مملکت (یا اس کی حکومت) کی ہیئت کذائی سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ جمہوری ہوگی یا آمرانہ۔ جمہوری ہوگی تو اس کا نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی۔ منتخب ہوگی تو طریق انتخاب کس قسم کا ہوگا ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ یہ سوالات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مملکت (یا دنیا کی کسی اور مملکت) اور اسلامی مملکت میں مابہ الامتیاز ان کی ہیئت کذائی یا شکل و صورت نہیں۔ ان میں حقیقی فرق بنیادی ہے۔ اسلامی مملکت کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینے سے بات کا واضح ہو جانا تو ایک طرف، اس سے مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ایمان کا صحیح تصور ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ ہماری نئی نسل کو تو چھوڑیئے، قدیم نسل کے ہاں بھی ایمان سے مراد چند الفاظ کا دھرا لینا ہوتا ہے، اور بس۔ جہاں تک کاروبار حیات اور معاملات حکومت کا تعلق ہے ان پر ایمان کی اثر اندازی کہیں نظر نہیں آتی۔ نہ ہی کسی کے ذہن میں اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک اس بنیاد کا صحیح تصور ہمارے سامنے نہ ہو، عام مملکتوں (حتیٰ کہ مسلمانوں کی مملکتوں) اور اسلامی مملکت کا فرق ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس موضوع پر ہم اکثر و بیشتر لکھتے چلے آ رہے ہیں لیکن ..... ہماری جدید تعلیم یافتہ نسل کی طرف سے جن سوالات کا اعادہ ہوتا رہتا ہے، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کی روشنی میں اس موضوع کی اہمیت کو سامنے لایا جائے۔ ان نوجوانان ملت کی طرف سے جس قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں، ان کا ملخص یہ ہے :-

(۱) قرآن مجید جن باتوں کو اخلاقی محاسن قرار دیتا ہے ـــــ مثلاً سچ بولو، جھوٹ نہ بولو۔ کسی کو فریب نہ دو، چوری نہ کرو، عصمت کی حفاظت کرو، کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو۔ کسی کو ناحق ستاؤ نہیں۔ غریبوں کی مدد کرو۔ محتاجوں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک شخص ان امور کا پابند ہے لیکن وہ نہ خدا کو مانتا ہے نہ وحی کو، نہ رسالت پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ تو اس کے اس انکار سے اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور جو شخص ان امور پر ایمان رکھتا ہے، اس میں اور اول الذکر میں عملی نقطۂ نگاہ سے کیا فرق ہوتا ہے

(۲) ایک قوم اپنے ہاں (مثلاً) وہی اقتصادی نظام رائج کر لیتی ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے لیکن وہ خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتی۔ تو اس کے اس اقتصادی نظام کو اسلامی کیوں نہیں کہا جا سکتا۔ یا

(۳) مسلمانوں کی کوئی مملکت، ایسے معاشی نظام کو اپنے ہاں رائج کر لیتی ہے جسے قرآن نے تجویز کیا ہے

تو وہ باقی شعبوں میں اس کا التزام نہیں کرتی، تو کیا اس مملکت کو اسلامی مملکت کہا جا سکے گا۔ اگر اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا، تو ایک مملکت یا ایک نظام (سسٹم) کس وقت اسلامی کہلانے کا مستحق سمجھا جائے گا۔

یہ ہے ملخص ان سوالات کا جو ہمیں اس سلسلہ میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ آیئے، ہم ان پر سطح سے ذرا نیچے اتر کر غور کریں۔

ان سوالات، اور اسی قسم کے دیگر شکوک و شبہات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ اور یہ شکوک اس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہمارا نوجوان طبقہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، فلانداً خدا، رسول، وحی، آخرت پر ایمان کے دعویدار ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ بالعموم ان لوگوں سے بھی پست ہیں جنہیں یہ دہریئے اور ملحد کہتے ہیں۔ بنا بریں سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں۔ ایمان چند الفاظ کے دہرا لینے کا نام نہیں۔ ایمان انسانی زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ، یا (ATTITUDE) کا نام ہے۔ مثلاً انسانی زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ عام حیوانی بچوں کی طرح، نر و مادہ کے جنسی اختلاط سے وجود میں آجاتا ہے۔ وہ طبیعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتا ـــــ کھاتا، پیتا، سوتا، جاگتا اور افزائشِ نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد، طبیعی قوانین کے مطابق مر جاتا ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان ایک متمدن حیوان واقع ہوا ہے، اس کے لئے اس کا سوسائٹی میں رہنا ضروری ہے۔ اور سوسائٹی میں رہنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متعین کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو مصلحت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے، اور دوسرا نظریہ یہ کہ جہاں تک طبیعی زندگی کا تعلق ہے، انسان اور حیوان میں بے شک کوئی فرق نہیں، لیکن انسان کی زندگی صرف طبیعی زندگی نہیں۔ اس کی طبیعی زندگی حیات کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس کی آخری کڑی نہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بھی جاری رہنا ہے۔ طبیعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے تو طبیعی قوانین کافی ہیں، لیکن ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے طبیعی قوانین سے ماورا ایک اور ضابطہ قوانین کی ضرورت ہے، جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہیں نہ سوسائٹی کی۔ یہ ازلی اور ابدی ہیں اور انسان کو ان کا علم اس وحی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے جو انبیاء کرامؑ پر نازل ہوتی تھی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمالِ حیات مستقل اقدار کے مطابق ہیں تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسے اخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی پست سطح میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اعمال کے ان اثرات کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہوتی ہے نہ عدالت کی، یہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں اور اسٹم ہوتے ہیں۔

یہ ہے زندگی کا دوسرا نظریہ۔ اس نظریہ کو علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رُو سے مبنی بر صداقت اور حقیقت سمجھنا اور قدم قدم پر اسے پیشِ نظر رکھنا، ایمان کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس طبیعی زندگی کے نظریۂ حیات کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ۔ (۴۷/۱۲) "جو لوگ

اور باقی شعبوں میں اس کا التزام نہیں کرتی، تو کیا اس مملکت کو اسلامی مملکت کہا جا سکے گا۔ اگر اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا، تو ایک مملکت یا ایک نظام (سسٹم) کس وقت اسلامی کہلانے کا مستحق سمجھا جائے گا۔

یہ ہے ملخص، ان سوالات کا جو ہمیں اس سلسلہ میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ آئیے، ہم ان پر سطح سے ذرا نیچے اُتر کر غور کریں۔

ان سوالات، اور اسی قسم کے دیگر شکوک و شبہات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ اور یہ شکوک اس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہمارا نوجوان طبقہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، فلہٰذا خدا، رسول، وحی، آخرت پر ایمان کے دعویدار ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ بالعموم ان لوگوں سے بھی پست ہیں جنہیں یہ دہریئے اور ملحد کہتے ہیں۔ بنابریں سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں۔ ایمان چند الفاظ کے دہرا لینے کا نام نہیں۔ ایمان، انسانی زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر، یا (ATTITUDE) کا نام ہے۔ مثلاً انسانی زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ، عام حیوانی بچوں کی طرح، نر و مادہ کے جنسی اختلاط سے وجود میں آجاتا ہے۔ وہ طبیعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتا —— کھاتا، پیتا، سوتا، جاگتا اور افزائشِ نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد، طبیعی قوانین کے مطابق مر جاتا ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ، انسان ایک متمدن حیوان واقع ہوا ہے، اس کے لئے اس کا سوسائٹی میں رہنا ضروری ہے۔ اور سوسائٹی میں رہنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متعین کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو مصلحت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے، اور دوسرا نظریہ یہ کہ جہاں تک طبیعی زندگی کا تعلق ہے، انسان اور حیوان میں بے شک کوئی فرق نہیں، لیکن انسان کی زندگی صرف طبیعی زندگی نہیں۔ اس کی طبیعی زندگی، حیات کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس کی آخری کڑی نہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بھی جاری رہنا ہے۔ طبیعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے تو طبیعی قوانین کافی ہیں، لیکن ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے، طبیعی قوانین سے ماوراء ایک اور ضابطۂ قوانین کی ضرورت ہے، جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار، نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہیں نہ سوسائٹی کی۔ یہ ازلی اور ابدی ہیں اور انسان کو ان کا علم اس وحی کی رو سے حاصل ہوتا ہے جو انبیاء کرامؑ پر نازل ہوئی تھی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمالِ حیات، مستقل اقدار کے مطابق ہیں تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، اسے اخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی پست سطح میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اعمال کے ان اثرات کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہوتی ہے نہ عدالت کی۔ یہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں اور سامنے آتے رہتے ہیں۔

یہ ہے زندگی کا دوسرا نظریہ۔ اس نظریہ کو علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رو سے مبنی بر صداقت اور حقیقت سمجھنا اور قدم قدم پر اسے پیشِ نظر رکھنا، ایمان کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس طبیعی زندگی کے نظریۂ حیات کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) "جو لوگ

حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور مرجاتے) ہیں وہ کفر کا نظریۂ حیات رکھتے ہیں"۔ یہ دونوں نظریاتِ حیات ایک دوسرے سے متمیز، باہمدگر متضاد اور منفرد ہیں۔ یعنی ان میں باہمدگر آمیزش نہیں ہوسکتی۔ ایمان کے نظریۂ حیات کے ساتھ کفر کی آمیزش نہیں ہوسکتی، اور کفر کے نظریہ کے ساتھ ایمان کا امتزاج ممکن نہیں: ھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّ مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ ۔ (۶۴/۲) "خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مؤمن"۔ سائنس کی زبان میں ان نظریات کو فارمولے سمجھنا چاہیئے۔ ایک فارمولا اسی صورت میں اپنے نتائج مرتب کرسکتا ہے جب اُسے بلا آمیزش عمل میں لایا جائے۔ اگر آپ اس فارمولے میں کسی اور فارمولے کی ذرا سی آمیزش بھی کردیتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ کبھی مرتب نہیں کرے گا۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی آمیزش کو شرک کہا جاتا ہے۔ زندگی، ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے مختلف حصّوں میں بانٹا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر انسانی زندگی کی یہ کیفیت ہوجائے کہ اس کا ایک گوشہ، ایک قسم کے نظریہ کے تابع رکھا جائے اور دوسرا گوشہ کسی دوسرے نظریہ کے تحت، تو اس کا نتیجہ ذلّت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ (۲/۸۵) "کیا تم اس قسم کا مسلکِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو کہ اس ضابطۂ حیات کے ایک حصّہ پر ایمان لے آئے اور دوسرے سے انکار کردیا۔ تم میں سے جو کوئی بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلّت و رسوائی اس کے حصّے میں آئے گی اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا"۔[1] اس لئے جو نظریۂ حیات اختیار کرنا ہو، اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۪ (۲/۲۰۸) "اے جماعتِ مؤمنین! تم سلامتی بخش نظامِ حیات (اسلامی نظام) میں پورے کے پورے بہ تمام و کمال، داخل ہو"۔ اسی صورت میں تم اس کے انسانیت ساز نتائج سے متمتع ہوسکو گے۔

پھر اسے بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ پیدائشی طور پر، نہ کوئی انسان مؤمن ہوتا ہے نہ کافر۔ ہر شخص کو ایمان یا کفر کا نظریہ خود اختیار کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۔ یا ۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا کہتا ہے یعنی وہ لوگ جو ایمان کا نظریہ اختیار کرتے ہیں، یا وہ لوگ جو کفر کا نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ یا مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ ۔ جو شخص غیر خدائی نظریۂ زندگی سے انکار کرتا ہے اور خداوندی نظریۂ حیات اختیار کرتا ہے۔ یعنی ان نظریات کو بالارادہ اختیار کیا جاتا ہے۔ نہ کوئی شخص بمجرد اس امر کے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوگیا، مؤمن قرار پاسکتا ہے، نہ غیر مسلموں کے ہاں پیدا ہونے والا، پیدائش کے اعتبار سے کافر۔ واضح رہے کہ قومی نقطۂ نگاہ سے یہ لوگ مسلمان اور غیر مسلم اقوام سے متعلق سمجھے جائیں گے، لیکن قرآنی مقاصد کے لئے انہیں ایمان یا کفر کا نظریہ اپنے ارادے اور فیصلے سے اختیار کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ان لوگوں سے بھی، جو پیدائشی طور

---

[1] مثال کے طور پر کمیونزم میں کیپٹلزم کی آمیزش کردیجیئے۔ وہ نہ کمیونزم رہے گا نہ کیپٹلزم۔ کوئی ازم بھی کسی متضاد ازم کی شرکت سے اپنے نتائج پیدا نہیں کرسکتی۔

کرے۔ اگر جدوجہد ہی نہ ہو تو ایمان، نتائج کیا پیدا کرے گا؟ آپ زراعت سے متعلق قوانین سے ہزار واقفیت رکھیں، اور ان قوانین کی صداقت پر آپ کو لاکھ یقین ہو، آپ کی زمین سے فصل اسی وقت پیدا ہوگی جب آپ ان قوانین کے مطابق کھیتی کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر کی ہے۔ مثلاً سورۂ عنکبوت میں ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (۲۹/۲)۔ "کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، چھوڑ دیئے جائیں گے اور وہ ان بھٹیوں میں سے نہیں گزارے جائیں گے" (جن سے گزر کر سونا کندن بنتا ہے)۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ جب منافقین آکر کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جاتا تھا کہ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَ رَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۹/۱۰۵)۔ (تمہارا دعویٰ ایمان ہم نے سن لیا ہے۔ اب) تم کچھ کر کے دکھاؤ۔ خدا اور اس کا رسولؐ اور جماعتِ مومنین، تمہارے کام دیکھ کر (اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ تم واقعی ایمان لے آئے ہو یا یہ یونہی رسماً الفاظ کا دُہرا دینا ہے)۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جب قانونِ مکافات کی رُو سے، لوگوں کی غلط روش کی پیدا کردہ تباہیاں سامنے آجائیں گی تو اس وقت نہ تو اس شخص کا ایمان اسے کچھ فائدہ دے گا جو ان تباہیوں کو دیکھ کر ایمان لائے گا۔ اَوْ کَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِھَا خَیْرًا (۶/۱۵۸) "اور نہ ہی اس شخص کا ایمان جس کے ایمان کے ساتھ اچھے اعمال شامل نہ ہوں گے"۔ اسی سورۃ میں دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ خدا لوگوں کے خالی دعوائے ایمان کی بنا پر ان کا دوست اور کارساز نہیں ہوتا۔ وَھُوَ وَلِیُّھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (۶/۱۲۸) "وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا دوست ہوتا ہے"۔ یہ "ایمان بلا عمل" والے ہی ہیں جن کے متعلق کہا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (۲/۸) "لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ مومن ہوتے نہیں"۔ ایمان، انسانی اعمال کے لئے جذبۂ محرکہ ہوتا ہے جو جذبہ اعمال کا محرک نہیں بنتا، وہ ایمان ہی نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ——— مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

——————(۰)——————

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ایمان اور عمل کا باہمی تعلق کیا ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ طبیعی نظریۂ حیات کی رُو سے، اخلاق (MORALS) کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کا تصوّر تو اقدار (VALUES) سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب طبیعی نظریۂ زندگی کی رُو سے مستقل اقدار کا کوئی وجود ہی نہیں، تو اس میں اخلاق کا تصوّر کہاں سے آجائے گا؟ آپ سوچئے کہ جو شخص نہ مستقل اقدار کا قائل ہے اور نہ ہی تسلسلِ حیات یا قانونِ مکافات کو تسلیم کرتا ہے، وہ اگر کوئی "نیک کام" کرتا ہے تو اس کے لئے اس کا جذبۂ محرکہ کیا ہو سکتا ہے؟ —ٹیمپل (Temple) کے الفاظ میں:-

خدا پر ایمان مرکز ہے اور بقائے حیات پر ایمان محیط۔ تمام مسئلہ اخلاقیات کی بس یہی کلید ہے۔ وہ مستقل اقدار جن کے توسط سے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں، ابدی

اور غیر فانی ہیں۔ (GOD AND THE ASTRONOMERS)

راشڈل، اپنی مشہور کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ:

یہ ناممکن ہے کہ حقیقت کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ علم الاخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو اور اخلاقیات کے متعلق ہمارا نظریہ، تصوّرِ حقیقت کو متاثر نہ کرے ...... لہٰذا اخلاقی قوانین کے مستقل اور مطلق ہونے کے لئے خدا پر ایمان لاینفک ہے۔

اور (DESTOJEVSKY) نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

اگر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔[1]

بات بالکل واضح ہے۔ "خدا پر ایمان" نہ ہو تو نظریۂ زندگی طبیعی رہ جاتا ہے اور اس نظریہ کی رُو سے زندگی، حیوانی سطح پر آجاتی ہے۔ حیوانی زندگی، بنیادی جبلّتوں (BASIC INSTINCTS) کے سہارے قائم رہتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا جذبہ، تحفّظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہے۔ اس جذبہ کا تقاضا ہے کہ ایک فرد، زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹے، اور چونکہ (حیوانی سطحِ زندگی پر) مستقل اقدار کا تصوّر نہیں ہوتا، اس لئے "اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے" کے سلسلہ میں "جائز اور ناجائز" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قوانین کارفرما ہوتے ہیں۔ سو اوّل تو سوسائٹی کے قوانین سے گریز (EVASION) کی سینکڑوں شکلیں انسان تراش لیتا، اور تراش سکتا ہے۔ دوسرے، سوسائٹی کے قوانین، خود ان افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں جو "زیادہ سے زیادہ سمیٹنے" میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اس نظریہ کے حاملین سے یہ توقع کرنا کہ وہ جان مار کر محنت کریں اور اپنی محنت کی کمائی میں سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کے لئے دے دیں، اس نظریہ کی اصل و اساس کے خلاف ہے۔ جو شخص یا قوم حیوانی جذبہ تحفّظِ خویش کے تابع، دوسروں کا سب کچھ سمیٹنے کی فکر میں ہو، وہ اپنا سب کچھ دوسروں کو کیسے دے دے گی۔ اس نظریۂ زندگی کے حامل، اگر دوسروں کے لئے کچھ دیں گے بھی، تو اس کا جذبۂ محرکہ کچھ اور ہوگا۔ مروجہ قانون کا ڈر، ستائش کی تمنا، صلہ کی امید، سوسائٹی میں پاپولر ہونے کا جذبہ ــــ قرآن کریم اس جذبۂ محرکہ کو "ریاء النّاس"[2] کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ النّساء میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۴/۳۸) "جو لوگ اپنے مال و دولت کو

۱۔ ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ پرویز صاحب کی تالیف "انسان نے کیا سوچا" ۔ باب اخلاقیات۔

۲۔ جب اچھے دنوں میں "ہنوز ہمارے سامنے مستقل اقدار کا تصوّر تھا، تو "ریاکاری" کی اصطلاح فریب کاری کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔ "وہ بڑا ریاکار ہے" اس کے معنی ہی یہ ہوتے تھے کہ وہ بڑا چالباز اور فریب کار ہے، اب ریاکاری، معاشرہ کا عام معمول ہو چکی ہے۔ اسے اب (POPULARITY) سمجھا جاتا ہے۔

لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے" ـــــ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے کس وضاحت سے یہ بات کہی ہے کہ اگر خدا اور آخرت پر ایمان نہ ہو تو پھر انفاق کا جذبہ محرکہ ریاء الناس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے کہ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (۹/۹۸) یا ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قانون کے خوف یا حکام کی خوشنودی کے لئے عطیات دیتے ہیں تو چونکہ اس کا جذبۂ محرکہ ان کے دل کا تقاضا نہیں ہوتا اس لئے ایسا محسوس کرتے ہیں گویا چٹی بھر رہے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں، جو لوگ "انفاق فی سبیل اللہ" کرتے ہیں ـــــ یعنی مستقل اقدار اور تسلسلِ حیات پر ایمان رکھتے ہوئے، دوسروں کی نشوونما کے لئے اپنی کمائی کو کھلا رکھنے والے ـــــ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جنہیں کچھ دیتے ہیں، ان پر کسی قسم کا احسان نہیں دھرتے، انہیں بطور خیرات نہیں دیتے جس سے ان کے جذبۂ عزتِ نفس کو ٹھیس لگے۔ (۲/۲۶۲) وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان ضرورت مندوں کا حق ہے جسے وہ ادا کر رہے ہیں ـــــ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (۷۰/۲۴)۔ لہٰذا، وہ ان سے کہتے ہیں کہ ـــــ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (۷۶/۹) "ہم تم سے اس کا نہ کوئی صلہ مانگتے ہیں نہ ہی ہم شکریہ تک کے متمنی ہیں"۔ اسی لئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ:-

جو کچھ تم ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیتے ہو، اس کا احسان جتا کر اور یوں ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچا کر اپنے کئے کرائے کو ضائع نہ کرو، اس شخص کی مانند جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور لوگوں کو دکھانے کی خاطر، اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ پتھر کی کسی چٹان پر ذرا سی مٹی پڑی ہو۔ اس پر زور کی بارش پڑے، اور وہ اس مٹی کو بہا کر لے جائے اور وہ چٹان صاف کی صاف رہ جائے.... اس کے برعکس، وہ لوگ جو مستقل اقدارِ خداوندی کی رُو سے اس ایمان کی بنا پر دوسروں کو دیتے ہیں کہ اس سے ان کی اپنی ذات میں ثبات اور استحکام پیدا ہو جائیگا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اونچی سی زمین پر نہایت عمدہ باغ ہو۔ جب وہی بارش برسے گی تو اس سے باغ میں دُگنا پھل آئے گا۔ اور اگر وہاں زور کی بارش نہ بھی ہو بلکہ یونہی چھوہار سی پڑے تو بھی اس کی سیرابی کے لئے کافی ہو جائے۔

(۲/۲۶۵-۲۶۴) و (۳/۱۱۶)

اس کے بعد قرآن بتاتا ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد، خدا اور آخرت کے ایمان پر ہوگی، اس کے نتائج، تمہاری آئندہ نسلوں تک کو بھی متمتع کرتے رہیں گے۔ یہی وہ اساسِ محکم ہے جس سے اس کی عمارت کو پائیداری نصیب ہوگی۔ غلط نظام ہیں "نیکیوں کے کام" کچھ وزن نہیں رکھتے، اس لئے کہ ان کا جذبۂ محرکہ محکم نہیں ہوتا۔ سورۂ توبہ میں قریش کو مخاطب کر کے کہا کہ:-

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینا اور کعبہ کی تزئین و آرائش

کر دینا، اس شخص (کے کاموں) کی مانند ہو جائے گا جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور خدا کی راہ میں مصروفِ جد و جہد رہتا ہے۔ (تم اپنے ذہن سے جو چاہے فیصلہ کر لو) میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (9/19)

سورۂ بقرہ میں ہے۔

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف، نیکی یہ ہے کہ تم خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لانے کے بعد، اپنے مال کو، اس کی کشش و جاذبیت کے باوجود، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (2/177)

کفر کا نظریۂ زندگی رکھنے والوں کے متعلق کہا کہ "ان کے اعمال کی مثال یوں سمجھو جیسے راکھ کا ڈھیر ہو اور جھکڑ چلے بہت زور کا۔ وہ اسے اڑا کر لے جائے گا۔" (14/18) کفر کے نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کی تمام سعی و عمل کا منتہیٰ اس دنیا کے مفادات ہی ہو سکتے ہیں۔ سورۂ کہف میں ہے۔

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ خسارہ میں رہنے والے لوگ کون ہیں! وہ جن کی ساری کوششیں اس دنیا کے مفاد کے حصول میں کھو گئیں اور اپنے دل میں سمجھتے رہے کہ ہم بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی اور حیاتِ آخرت سے انکار کرتے ہیں۔ سو ان کا کیا کرایا سب رائیگاں چلا گیا۔ نتائج برآمد ہونے کے وقت ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزان تک بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔ (18/103—105)

سورۂ محمدؐ میں ہے کہ تم روئے زمین پر چلو پھرو۔ اور پھر دیکھو کہ جن قوموں کا نظریۂ حیات، طبیعی زندگی تھا، ان کا انجام کیا ہوا (47/10) ان کے اعمال رائیگاں گئے اور آخرالامر وہ بڑے خسارے میں رہے۔ (5/5) ایمان بالآخرت کی اہمیت کے متعلق داستدل لکھتا ہے۔

انسان کے موجودہ اعمال اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال آج ہوں گے اسی قسم کا اس کا "کل" ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ بیش یا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا۔ اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا، کیونکہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ جو یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا۔۔ اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سر کھپانے کی ضرورت کیا ہے؟

---

[1] قرآنِ مجید میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ مثلاً (2/214) و (3/141) و (3/142) و (9/69)۔

یہ ہے ایمان کا تعلق اعمال کے ساتھ۔ اسے پھر سمجھ لیجئے کہ ایمان (نظریۂ حیات) ہی عمل کے لئے جذبۂ محرکہ بنتا ہے اس لئے اعمال کو ایمان سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جو جذبہ بھی آپ کے عمل کا محرک ہو گا، وہ آپ کا "ایمان" کہلائے گا۔ ہم اس وقت بات کی وضاحت کے لئے اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ ورنہ قرآن نے صحیح نظریۂ زندگی کو ایمان اور غلط نظریہ کو کفر —— یعنی صحیح نظریہ سے انکار —— کہہ کر پکارا ہے۔ اگر آپ "ایمان" کی جگہ نظریۂ زندگی کہہ لیں تو پھر یوں کہا جائے گا کہ نظریۂ زندگی ان مقاصد کا تعین کرتا ہے جن کے حصول کے لئے انسان کوشش کرتا ہے۔ یوں ایمان، عمل کی بنیاد قرار پاجاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق پکال نے کہا ہے کہ

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پہ ایمان رکھے۔۔۔ جب اسے ایمان کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بیکار اور خراب مقاصد پہ ٹھ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دُنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلاء ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو بُرے راستے اسے اچھے لگنے لگ جاتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے۔ بے راہ روی ختم ہو اور یورپ والے نئی قدروں پہ ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی حرارت ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔

"ایمان" درحقیقت انسان کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ "میں ایسا کیوں کروں ؟" اور جو شخص مستقل اقدارِ حیات (خدا، وحی، رسالت) اور انسانی ذات (امکاناتِ عمل اور حیاتِ آخرت) پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس سوال کا اطمینان بخش جواب دے نہیں سکتا کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنی جان کیوں مارے ؟ اگر اس کا جواب کسی دنیاوی فائدے کا حصول نہیں تو جذباتی ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جذبات کسی نظامِ عمل کے لئے محکم اور پائیدار اساس بن نہیں سکتے۔ اساسِ محکم تو صحیح نظریۂ حیات کی صداقت پہ یقینِ محکم ہی بن سکتا ہے۔ غلط نظریۂ حیات نے اسی اساسِ محکم کو گم کر دیا ہے جس کی وجہ سے، افراد اور اقوام دونوں کی زندگی جہنم کی سی ہو رہی ہے۔ عصرِ حاضر کے ممتاز ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ینگ نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں لکھا ہے کہ

> میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیۂ نفس کیا، ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس میں زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی کمی نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو زندہ مذہب انسانوں کو مہیا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دے دی جائے جو ان سے گم ہو چکی تھی یہی ان کی دوا تھی —— عقیدہ، اُمید، محبت، نگاہ خوردبیں۔ (P. ۲۶۴)

ص۱ صحیح نظریۂ زندگی قرآن مجید ہی سے مل سکتا ہے اسے ہم علیٰ وجہ البصیرت ثابت کر سکتے ہیں لیکن اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں

اور یہی "شے" ہمارے ہاں بھی مفقود ہے۔ ہماری دشواری ایک اور بھی ہے۔ ہم جب اپنے آپ کو مسلمان اور دوسروں کو غیر مسلم (کافر) کہتے ہیں تو اس سے سمجھ یہ لیتے ہیں کہ ہم صاحبِ ایمان ہیں اور غیر مسلم کو ایمان نصیب نہیں ـــــ اس بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے بعد، جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اخلاقی حیثیت سے کس قدر پست ہیں اور (بعض) غیر مسلم بڑے اچھے اچھے کام کرتے ہیں، تو ہمارے دل میں لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کا اعمال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر ایمان اور اعمال کا تعلق لاینفک ہوتا، تو ہم (مسلمان۔ یعنی صاحبِ ایمان) اچھے کام کرتے اور غیر مسلم اخلاقی اعتبار سے پست سطح پر ہوتے۔ اس خیال کی وجہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ غلط فہمی ہے جس کی رُو سے ہم نے اپنے آپ کو صاحبِ ایمان سمجھ رکھا ہے۔ (جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے)، ایمان ایک نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قبول اور اختیار کرنے کا نام ہے۔ یہ قلب و دماغ کا ایک مثبت عمل ہے جس سے انسان میں ایک خاص قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہی نظریہ انسانی زندگی کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جد و جہد کو "نیک کام" کہا جاتا ہے۔ اس نظریۂ زندگی (ایمان) اور اس کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی نیک اعمال (اعمالِ صالح) کی عمارت کا نام "الاسلام" ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ

(۱) اسلامی مملکت اسے کہیں گے جس کا تمام کاروبار (کوئی ایک گوشہ نہیں بلکہ تمام کاروبار) وحی (قرآن) کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع سرانجام پائے۔ اس قسم کی مملکت کے نظام کو اسلامی نظام کہا جائے گا۔

(۲) یہ ہو نہیں سکتا کہ مملکت کا کوئی ایک گوشہ (سیاسی، معاشرتی، معاشی) تو اسلامی ہو، اور باقی شعبے غیر اسلامی ہوں یا باقی تمام شعبے اسلامی ہوں اور کوئی ایک شعبہ غیر اسلامی ہو۔ اگر مملکت کا کوئی ایک گوشہ بھی غیر اسلامی ہوگا تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکے گی۔ اسلامی مملکت کا ہر گوشہ اسلامی ہوتا ہے۔ جنت کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جسے جہنم کہا جا سکے۔ نہ ہی جہنم کا کوئی ایک گوشہ، جنت قرار پا سکتا ہے۔ جس طرح انسان کا کوئی حصہ مومن اور کوئی حصہ کافر نہیں ہوتا اسی طرح مملکت کا ایک گوشہ اسلامی اور دوسرا گوشہ غیر اسلامی نہیں ہو سکتا۔

(۳) اس قسم کی (اسلامی) مملکت ان لوگوں کے ہاتھوں قیام پذیر ہوتی ہے جو خدا، وحی، رسالت (مستقل اقدارِ حیات)، انسانی ذات، قانونِ مکافاتِ عمل، اور تسلسلِ حیات (مرنے کے بعد کی زندگی) پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھیں۔ اور ان کے اس یقین (ایمان) کا مظاہرہ ان کے اعمالِ حیات، ان کی سیرت و کردار، ان کے روزمرہ کے کاموں سے ہو۔ انہی افراد کی حیثیتِ اجتماعیہ کو ملتِ اسلامیہ، امتِ مسلمہ، جماعت مومنین، کہا جاتا ہے ـــــ مملکت، قراردادِ مقاصد پاس کرنے، چند شرعی قوانین نافذ کرنے۔ یا کسی خاص ٹائپ کی حکومت قائم کرنے یا کوئی خاص معاشی پروگرام اختیار کرنے سے اسلامی نہیں بن جاتی ـــــ نیست ایں کار فقیہاں اے پسر! مملکت، افرادِ مملکت کے قلب و نگاہ میں تبدیلی سے اسلامی بن سکتی ہے اور قلب و نگاہ کی تبدیلی صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

سونے کے زیورات کی شرعی حیثیت

سادگی مسلمانوں کا زیور ہے۔ لیکن آج ہم نمود و نمائش کی زندگی میں اس حد تک بڑھ چکے ہیں۔ کہ ایسے معاملات میں جائز و ناجائز کی تمیز بھی اٹھ چکی ہے۔ انہی نمود و نمائش کی چیزوں میں ایک سونے کے زیورات ہیں جن کے غلط رواج کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں کئی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سونے کے زیورات عورت کی کمزوری ہیں۔ اس کمزوری کی نفسیاتی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ ان زیورات کے ذریعے ایک قسم کا معاشی تحفظ محسوس کرتی ہے۔ لیکن یہ مفروضہ کسی حد تک ٹھیک ہونے کے باوجود بڑی حد تک خلافِ حقیقت ہے جس کی تفصیلات آئندہ سطور میں سامنے آئیں گی۔ پھر یہ زیورات کسی ایک کے لئے معاشی تحفظ ہوں گے تو دوسری بہت سی عورتیں جنہیں یہ میسّر نہیں، ان کے لئے عدمِ تحفظ کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ کسی تقریب میں جب کوئی امیر عورت لاکھوں روپے کا زیور پہن کر طرح طرح سے اس کی نمائش کرتی ہے تو اس وقت غریب عورتوں کے دل پر جو کیفیت گزرتی ہے اس کا شاید ہی کسی کو اندازہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ ان غریب عورتوں کے لواحقین یہ صورتِ حالات دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی عورتوں کو سونے کے زیورات مہیا کرنے کے لئے کمائی کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر زیورات کی مالک جس عورت کے لئے معاشی تحفظ کا دعوے کیا جاتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ فیشن بدلنے کے ساتھ وہ اپنے زیورات کو نت نئے ڈیزائنوں میں تبدیل کرواتی رہتی ہے جس کی وجہ سے سونے کی کافی مقدار ضائع ہو جاتی ہے۔ بلکہ صرافوں کا تو یہاں تک دعوے ہے کہ جو زیور ان کے پاس تین دفعہ بننے کے لئے آجائے تو اس میں اصل مالک کے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔

انہی خرابیوں کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے سونے کے زیورات استعمال کرنے ناجائز قرار دے دیئے تھے۔ حدیث کی مشہور و مستند کتابوں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد میں ایک درجن سے زیادہ احادیث ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں میں سونے کے زیورات پہننے کا عام رواج تھا جسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے ختم کیا۔ اس سلسلے میں آپ کے مختلف ارشادات اور اقدامات کا اثر اتنا گہرا تھا کہ

آج بھی عرب ممالک میں سونے کے زیورات کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ حدیث کی مذکورہ بالا مستند کتابوں میں ایک بھی ایسی روایت نہیں ملتی جن میں صراحتہً تو کجا اشارتاً بھی سونے کے زیورات کا جواز ملتا ہو۔ بعض علماء نے سُنن ترمذی کی ایک غیر متعلق حدیث سے سونے کے زیورات کا جواز ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس حدیث کو نقل کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے چند وہ احادیث پیش کی جائیں کہ جن میں حضور صلعم نے بڑے واضح الفاظ میں ان زیوروں کے استعمال سے نہ صرف یہ کہ منع فرمایا بلکہ ان کے استعمال کرنے والیوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا۔ ان ارشادات میں آپ نے عورتوں کو سونے کی بجائے چاندی کے زیورات استعمال کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت حذیفہ کی ایک بہن سے روایت ہے:۔

عن اخت لحذیفة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا معشر النساء اما لکن فی الفضة ما تحلین بہ۔ اما انہ لیس منکن امرأة تحلی ذھبا تظھرہ الا عذبت بہ (سنن ابوداؤد باب ماجاء فی الذھب للنساء۔ جلد دوم صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ مصر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عورتوں کے گروہ! تم چاندی کے زیور کیوں نہیں پہنتیں کیوں کہ تم میں سے جو عورت سونے کا زیور پہنے گی قیامت کے دن اُسے اسی زیور سے عذاب دیا جائے گا۔

ایک دوسری روایت میں حضرت اسماءؓ بنت یزید سے روایت ہے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ایما امرأة تقلدت قلادة من ذھب قلدت فی عنقھا مثلہ من النار یوم القیامة وایما امرأة جعلت فی اذنھا خرصا من ذھب جعل فی اذنھا مثلہ من النار یوم القیامة (ایضاً صفحہ ۲۰۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت نے بھی اپنے گلے میں سونے کا گلوبند پہنا تو قیامت کے دن اسے ویسا ہی آگ کا گلوبند پہنایا جائے گا۔ اور جو عورت بھی اپنے کانوں میں سونے کی بالیاں پہنے گی تو قیامت کے دن اسی کی مانند اس کے کانوں میں آگ ڈالی جائے گی۔

ایک اور حدیث میں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے مردوں کو ان کی ذمہ داری سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنی عورتوں کے لئے سونے کے زیورات مہیا کریں گے تو وہ کوئی اچھا کام نہیں کریں گے۔

عن ابی ھریرة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من احب ان یحلق حبیبہٗ حلقة من نار فلیحلقہٗ حلقة من ذھب ومن احب ان یطوق حبیبہٗ طوقا من نار فلیطوقہٗ طوقا من ذھب ومن احب ان یسور حبیبہٗ من نار

فلیسورہا سوارًا من ذھب ولکن علیکم بالفضۃ فالعبوا بہا (ایضاً صفحہ ۲۰۹)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ تم میں جو یہ پسند کرتا ہے کہ اپنی محبوب کو آگ کی انگوٹھی پہنائے تو پھر وہ اسے بے شک سونے کی انگوٹھی پہنائے اور تم میں جو پسند کرتا ہے کہ اپنی محبوب کے گلے میں آگ کا طوق پہنائے تو پھر وہ اسے سونے کا گلوبند پہنا سکتا ہے۔ اور تم میں سے جو یہ پسند کرتا ہے کہ اپنی محبوب کو آگ کے کنگن پہنائے تو پھر وہ اسے سونے کے کنگن پہنا سکتا ہے! تم پہ لازم ہے کہ چاندی کے زیور استعمال کرو اور اسے جس طرح چاہو استعمال کرو۔

اس حدیث میں حضورصلعم نے اسی مضمون کو جو مذکورہ بالا احادیث میں گزر چکا ہے نئے انداز سے بیان فرمایا ہے۔ خلاصہ یہ کہ عورتوں کو سونے کے زیورات پہنانے، آگ کے زیورات پہنانے کے برابر ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان کو ایسے نمود و نمائش سے بچنا چاہیئے۔

اسی طرح صحیح بخاری کی کتاب العلم اور کتاب اللباس میں دو ایسی احادیث ملتی ہیں جن کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے عورتوں کو سونے کے زیورات پہننے سے منع فرما دیا تھا جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنے یہ زیورات اتار کر حضورصلعم کی خدمت میں پیش کر دیئے تاکہ وہ انہیں جس طرح مناسب سمجھیں استعمال میں لے آئیں۔

عن ابن عباس قال اشھد علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما خرج و معہ بلال فظن انہ لم یسمع النساء فوعظھن و امرھن بالصدقۃ فجعلت المرأۃ تلقی القرط والخاتم و بلال یاخذ فی طرف ثوبہ (کتاب العلم باب عظۃ الامام النساء و تعلیمھن)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نبی صلعم کے پاس حاضر ہوا جب آپ (مسجد) سے نکلے اور آپ کے ساتھ حضرت بلالؓ بھی تھے تو آپ نے گمان فرمایا کہ شاید عورتوں نے آپ کے ارشادات کو نہیں سنا۔ چنانچہ آپ نے انہیں نصیحت فرمائی اور اللہ کے راستے میں خیرات کا حکم دیا۔ تو عورتوں نے اپنی کانوں کی بالیاں اور ہاتھوں کی انگوٹھیاں پھینکنی شروع کر دیں اور حضرت بلالؓ انہیں ایک کپڑے میں سمیٹتے جاتے تھے۔

حضرت عباسؓ سے ایک دوسری روایت کا کم و بیش یہی مضمون ہے۔

عن ابن عباسؓ شھدت العید مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصلی الخطبۃ وزاد ابن جریج فاتی النساء فجعلن یلقین الفتخ والخواتیم فی ثوب بلال۔

(کتاب اللباس صحیح بخاری)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ عید کی نماز پڑھی۔ پس آپؐ نے خطبہ دیا۔ ابن جریج نے اس روایت میں یہ اضافہ کیا کہ پس آپؐ عورتوں کے

پاس تشریف لائے تو انہوں نے اپنے کانوں کی بالیاں اور ہاتھ کی انگوٹھیاں حضرت بلالؓ کے کپڑے میں ڈالنی شروع کر دیں۔

اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے سونے کے زیورات کو پہننا یا تو مکروہ قرار دیا یا سخت ناپسندیدہ یہاں تک کہ اس پر وعید سنائی۔

اب ہم اس حدیث کو لیتے ہیں کہ جس سے عورتوں کے لئے سونے کے زیورات کا جواز نکالا جاتا ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں ان زیورات کے پہننے کی ایک روایت بھی نہیں ملتی۔ صرف سنن ترمذی میں ایک غیر متعلق روایت سے اس کے جواز کے بارے میں استدلال کیا جاتا ہے اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابی موسی الاشعری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال حرم لباس الحریر والذھب علی ذکور امتی و احل لاناثھم۔

(باب ماجاء فی الحریر والذھب کتاب اللباس سنن الترمذی الجزء الرابع صفحہ ۲۱۹)

حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میری امت کے مردوں پر ریشم اور سونے کا لباس حرام قرار دیا گیا اور اس کی عورتوں کے لئے یہ حلال ہے۔

ملاحظہ ہو کہ یہاں "لباس الحریر والذھب" کے الفاظ ہیں۔ جس کے معنی ریشم اور سونے کا لباس، ہے نہ کہ زیورات۔ ظاہر ہے کہ جب زیورات کی حرمت کے بارے میں رسول اللہ صلعم کے واضح ارشادات دوسری احادیث میں موجود ہیں جنہیں اوپر نقل کیا جا چکا ہے تو پھر ایک غیر متعلق حدیث سے ایسی ناجائز چیزوں کا جواز ثابت کرنا کسی طرح مناسب قرار پا سکتا ہے۔

ہاں بعض روایات سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ حضور صلعم نے بعض طبی وجوہات کے بناء پر سونے کی تھوڑی مقدار کے استعمال کی اجازت دی۔ مثلاً سونے کی تار سے دانت باندھ لینے وغیرہ لیکن جہاں تک اس کے زیورات کا تعلق ہے تو کسی حدیث سے ان کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

یہ ان اسلامی تعلیمات کا اثر ہے کہ آج بھی عرب معاشرے میں سونے کے زیورات کا رواج نہیں ہے۔ دراصل ہم نے جہیز، برات اور اس قسم کی دوسری رسومات کی طرح سونے کے زیورات پہننے کی رسم بھی ہندوؤں سے مستعار لی ہے۔ ان تمام غیر اسلامی رسوم نے غریبوں کے لئے زندگی دوبھر کر دی ہے اور نتیجتاً ہمارے معاشرے میں دوسری بہت سی خرابیوں کو جنم دیا ہے جن میں سب سے خطرناک برائی جائز اور ناجائز کی تمیز سے ہماری بے اعتنائی ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل حل وعقد اس مسئلہ کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنائیں۔

طلوعِ اسلام

کاروانِ انسانیت اپنی اوّلین منزل یعنی غاروں کی زندگی سے جن اعتقادات، رسومات اور معاشرتی

جاذبیتوں کو ساتھ لئے چلا آرہا ہے ان میں زیورات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ قدیم مندروں میں تصاویر کو دیکھئے یا بُت کدوں کے مجسموں کو۔ اہرام مصر کی حنوط شدہ لاشوں پر نگاہ ڈالئے یا ٹیکسلا، ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے عجائب خانوں کی سیر کیجئے۔ ہر جگہ آپ کو کسی نہ کسی شکل میں زیورات دکھائی دیں گے۔ ابتدائی ادوار میں زیورات آرائش اور زیبائش کے طور پر پہنے جاتے تھے۔ خود ہمارے ہاں بھی چند سال ادھر تک ان کی یہی حیثیت تھی۔ لیکن اب یہ آرائش سے آگے بڑھ کر امارت کی نمود کا ذریعہ بن گئے ہیں اور ان کی نمائش میں بڑا فخر محسوس کیا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز نمودِ امارت کا ذریعہ بن جائے تو وہ غریبوں کے لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر عجیب الجھنوں اور پریشانیوں کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہمارے ہاں یہی ہو رہا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ہمارے ہاں دولت کا سیلاب آگیا ہے۔ لیکن یہ تشبیہ صحیح نہیں۔ سیلاب کا پانی پہلے نشیب کی طرف جاتا ہے۔ گڑھے بھرتا ہے اور پھر اس کی سطح ابھرتی ہے۔ لیکن اس ابھار میں وہ اپنی سطح کو ہمیشہ ہموار رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں دولت اس انداز سے نہیں آئی۔ اس نے گڑھوں کو اور زیادہ گہرا کر دیا ہے اور میدانوں کے فراز کو ٹیلوں اور چٹانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس سے معاشرتی ناہمواریاں بڑی شدت اختیار کر گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نچلا طبقہ اور اوپر کا طبقہ دونوں نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئے ہیں۔

قرآن مجید زینت کی چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتا (۷/۳۲)۔ لیکن وہ اس مقصد کے لئے موتیوں کو نمایاں حیثیت دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے، وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا (۱۶/۱۴) "تم سمندر سے سامانِ زیبائش (یعنی موتی) نکالتے ہو اور انہیں زینت کے لئے پہنتے ہو"۔ اس نے جنتی زندگی کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے تو اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے، يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ (۲۲/۲۳) "اس میں انہیں سونے کے کنگن اور موتیوں کے زیور پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ریشمی ہوگا"۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ تمثیلی بیان ہے۔ لیکن اگر اسے حقیقت پر بھی محمول کر لیا جائے تو اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ جنت کی جن نعمتوں کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے وہ وہاں ہر فرد کو میسر ہوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک طبقہ کے پاس ان چیزوں کی فراوانیاں ہوں اور دوسرا طبقہ ان سے محروم ہو۔ جنت کی زندگی میں طبقاتی امتیاز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے وہاں اس قسم کا سامانِ زینت کسی خرابی پیدا کرنے کا موجب نہیں ہوگا۔

لیکن ہمارے دور میں زیورات کے مسئلہ پر اقتصادی نقطۂ نگاہ سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سونا یا چاندی اپنی ذات میں (INTRINSICALLY) کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ یہ دوسری دھاتوں کی طرح دھاتیں ہیں۔ لیکن انسانوں نے انہیں خاص اہمیت اور قیمت عطا کر رکھی ہے۔ حتیٰ کہ اب مملکتوں کی ساکھ کا دارومدار سونے کے محفوظ ذخائر قرار پا چکے ہیں۔ انہیں یہ حیثیت بھی خود ہم نے عطا کر رکھی ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

تو قدرِ خویش ندانی بہا ز تو گیرد   وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

(باقی بر صفحہ ۲۱)

بابُ المراسلات

۱۔ فیصل ایوارڈ اور مودودی صاحب

سوال:۔ سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے مودودی صاحب کو حال ہی میں جو ایوارڈ ملا ہے، میں اس کے دوسرے گوشوں کے متعلق گفتگو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ بسردست اس کا صرف وہ گوشہ سامنے لانا چاہتا ہوں جس کا تعلق شاہ فیصل (مرحوم) کی اس تصویر سے ہے جو اس میڈل (تمغہ) پر ڈھلی ہوئی شکل میں منقوش ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مودودی صاحب نے انسانوں کی ہر قسم کی تصاویر کو حرامِ مطلق قرار دیا تھا۔ براہِ کرم بذریعہ طلوعِ اسلام مطلع فرمایئے کہ کیا یہ صحیح ہے؟ اور اگر صحیح ہے تو پھر مودودی صاحب اس مصوّر تمغہ کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

جواب:۔ تصویر کے متعلق مودودی صاحب نے ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۶۲ء میں سورۃ السباء کی تفسیر کے سلسلے میں، بڑی تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا تھا:۔

> اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی اکرمؐ کے صحیح ارشادات، صحابہ کرامؓ کے عمل اور فقہاءِ اسلام کے متفق فتاویٰ کی رُو سے ایک مسلّم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثرہ لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔
>
> بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے۔ نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقہ کو۔
>
> بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہئیں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں۔ یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو۔ باقی دوسری تصویروں اور مجسموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام و ارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے ذہنوں

پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے ..... اس لئے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم محض بت پرستی کے استیصال کی خاطر دیا ہے، اصلاً غلط ہے۔ شارع نے مطلقاً جاندار اشیاء کی تصویر کو روکا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ ... شارع کے متبع ہیں، تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیئے۔ ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علّتِ حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں۔

(صفحات ۳۰ - ۲۸)

اس مطلق ممانعت میں استثنائی صورتوں کے متعلق انہوں نے لکھا ہے:-

اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثناء ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو یا جب کہ تصویر کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لئے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہے۔ مثلاً پاسپورٹ، پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لئے تصویریں محفوظ کرنا۔ ڈاکٹروں کا علاج کے لئے یا فنِ طب کی تعلیم کے لئے مریضوں کی تصویریں لینا اور جنگی اغراض کے لئے فوٹوگرافی کا استعمال ..... لیکن لیڈروں کی تصویریں اور جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں کسی طرح بھی جائز اور حقیقی ضرورت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ خصوصاً لیڈروں کی تصویریں تو بندگانِ خدا کو اس خطرے سے بہت ہی قریب پہنچا دیتی ہیں جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے ..... سکوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامتِ حاکمیت ثبت کیا جانا، کیا یہ سب بت پرستی کی جڑیں نہیں؟ ..... میں تو چھوٹے بچوں کی تصویر لینے کو بھی اسی لئے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے۔ (رسائل و مسائل حصہ اول ستمبر ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۹۱ - ۱۹۰)

تصویر کے متعلق مودودی صاحب کا عقیدہ واضح ہے۔ وہ انسانوں کی تصویر کو حرام مطلق قرار دیتے ہیں۔ اور انہوں نے جو استثنائی صورتیں بتائی ہیں ظاہر ہے کہ فیصل ایوارڈ پر شاہ مرحوم کی تصویر (جسے مجسمہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) ان میں سے کسی شق کے تابع بھی نہیں آتی۔

(۰)

۲۔ انتخابات اور جماعتِ اسلامی

سوال:- جماعتِ اسلامی کے ترجمان، ہفتہ وار ایشیا کی ۶ مئی کی اشاعت کے اداریہ کا عنوان ہے:-

اب ہمیں انتخابات کو اسلام کے لئے جیتنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مودودی صاحب نے انتخابات میں حصہ لینے کو شرعاً ناجائز قرار دیا تھا؛ کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے کہ میری یادداشت صحیح ہے یا نہیں؟

جواب: آپ کی یادداشت بالکل صحیح ہے۔ مودودی صاحب نے "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا جو ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اکتوبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے اس موضوع پر کتاب وسنت کی روشنی میں بحث کرنے کے بعد لکھا تھا:۔

اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک بڑی امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعتِ اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ یہ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔ (صفحہ ۱۳-۱۲)

اب رہا یہ کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم اسلام کی خاطر انتخابات جیتنا چاہتے ہیں تو اس قسم کی وجوہاتِ جواز کی قلعی بھی مودودی صاحب نے اپنے اسی مقالہ میں کھول دی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا:۔

موجودہ زمانہ میں اس گھناؤنی حقیقت کو بہت سے خوشنما الفاظ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہم ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں ہم اس لئے اٹھ رہے ہیں کہ اگر ہم نہ اٹھیں گے تو بُرے اور نالائق لوگ منتخب ہو جائیں گے۔ ہم اصلاح اور ترقی کا ایک پروگرام رکھتے ہیں اور قوم سے اس لئے ووٹ مانگتے ہیں کہ اگر وہ اسے پسند کرے تو اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں منتخب کرے ـــــ اور قوم آخر خود کس طرح قوم کے آدمی چھانٹ سکتی ہے جبکہ کام کا ارادہ اور خواہش نہ رکھنے والے لوگ خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو اور اپنے اپنے پروگراموں کو اس کے سامنے پیش نہ کریں۔ ایسی ہی اور بہت سی دوسری باتیں یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں کہ.... امیدواری محض لالچ ہی کی بنا پر نہیں بلکہ بے غرضانہ اور مخلصانہ خدمت کی نیت سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن تمام حیلوں اور دلیلوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ جس خدمت کے ساتھ خطرات، نقصانات اور تکالیف وابستہ ہوں اس کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا تو بلاشبہ ایک سچے جذبۂ خدمت کی علامت ہو سکتا ہے۔ مگر جہاں خدمت

اور دولت و حکومت باہم مل جُل ہوں وہاں اپنے آپ کو خود پیش کرنے میں اخلاص کے امکانات بہت کم اور حرص و طمع کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ (ص۱۰)

یہ تھے اس "ناپاک طریقِ انتخاب" کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات۔ جس کی "جڑ کاٹنے کے لئے" وہ اُٹھے تھے۔

انہوں نے ۱۵ جون ۱۹۵۰ء کو جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر میں ایک پریس کانفرنس میں:۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا آپ کسی دوسری پارٹی کے صالح نمائندے کی انتخابات میں حمایت کریں گے۔ فرمایا کہ موجودہ طریقوں پر، پارٹی ٹکٹ پر کسی امیدوار کا کھڑے ہونا خود ناہلیت (DISQUALIFICATION) کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ کیونکہ جو شخص امیدوار ہو وہ صالح ہو ہی نہیں سکتا۔ (مولانا مودودی کی تقاریر حصہ دوم ص۶۹۔ طبع اوّل ستمبر ۱۹۷۶ء)

ان کے اس مؤقف کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ اگر کسی شخص کا کسی منصب کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہونا خلافِ اسلام ہے تو، حضرت علیؓ کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ جو منصبِ خلافت کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے جواب میں انہوں نے لمبی چوڑی بحث کے بعد کہا:۔

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف تو ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسول کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی۔ مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہو گا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کرلیں۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء۔ ص۲۸)

اور اس کے باوجود مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے بعد کے انتخابات میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے آدمی بطور امیدوار کھڑے بھی کئے — اور اسے عین مطابقِ اسلام قرار دیا۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

(ضمناً) دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے ایک دن پہلے مودودی صاحب نے فرمایا تھا:۔

انتخابات میں شکست، سوشلسٹوں کا مقدّر بن چکی ہے، جماعتِ اسلامی کے نمائندے انتخابات میں بڑی تعداد میں کامیاب ہوں گے۔ ماضی قریب میں، جماعتِ اسلامی کی اہمیت اور مرکزیت میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان حالات میں جماعت کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور اگلے ہی دن انتخابات کے نتائج کی رو سے انہیں عبرت آموز شکست ہوئی۔ ۸ دسمبر ۱۹۷۰ء کو مرکزِ جماعت میں، جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ مولانا صاحب کی اس قدر حتمی یقین دہانی کے باوجود، یہ کیا ہوا! تو مولانا نے

ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے فرمایا:-

یاد رکھئے! نہ اسلام ناکام ہوا ہے۔ نہ اہلِ اسلام کو شکست ہوئی ہے بلکہ فی الحقیقت وہ لوگ ناکام ہو گئے ہیں جنہوں نے سوشلزم کے حق میں اپنی رائے دی ہے۔ انسانی تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی رشد وہدایت کی ترویج میں کھپا دی۔ لیکن ان کی قوم نے ان کی اس تبلیغ پر کان نہ دھرا اور آخرکار ہلاک ہو کر رہ گئی۔ یعنی انبیاء علیہم السلام کا مشن اور ان کا پیغامِ ہدایت ناکام نہیں ہوا۔ بلکہ خود وہ قوم ناکام ہو گئی جس نے ان کے اس پیغام کو سننے اور ان کے اس مشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ناکامی حق کا مقدر نہیں ہے۔ خواہ بظاہر اس کی ناکامی کے آثار کتنے ہی نمایاں ہوں۔ اسی طرح کامیابی باطل کا مقدر نہیں ہے۔ خواہ بظاہر اس کی کامیابی کا کتنا ہی چرچا ہو۔ ہمارے پیشِ نظر یہ ہونا چاہیئے کہ ظاہری فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتے جائیں۔

اور اس کے بعد مودودی صاحب نے اپنے رفقاء سے راز کی بات بھی کہدی کہ:-

جماعتِ اسلامی محض ایک سیاسی جماعت نہیں ہے۔ وہ ایک نظریاتی تحریک ہے اور انتخابات اس کے کام کا صرف ایک حصہ ہیں۔ ہم نے نہ پہلے کبھی انتخابات پر انحصار کیا ہے اور نہ آئندہ انتخابات پر انحصار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (ایشیا - ۱۳ دسمبر ۱۹۷۰ء)

سوال پیدا ہوا کہ اگر اس جماعت کا انحصار انتخابات پر نہیں تو پھر انحصار کس بات پر ہے؟ اس کے متعلق میاں طفیل محمد صاحب نے جماعتِ اسلامی کی مسجد کی بنیاد رکھتے وقت اپنی تقریر میں فرمایا تھا:-

چند لوگ ہمیں کمزور تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن جب وقت آیا اور ہم نے اقتدار سنبھالنے کا ارادہ کر لیا تو یہ لوگ تو کیا امریکہ، بھارت اور روس مل کر بھی ہماری طاقت کے سامنے ایک منٹ نہیں ٹھہر سکیں گے۔ مشرقی پاکستان میں جماعت کے پانچ سو کارکن تھے۔ لیکن انہوں نے اس نازک دور میں بھی اپنی بھرپور طاقت کا لوہا منوا لیا۔ یہاں جماعت کے چند ہزار کارکن ہیں۔ لیکن ہم کمزور ہرگز نہیں ہیں۔ اور جب وقت آیا تو لوگوں کو ہماری طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ جماعتِ اسلامی کی تحریک پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ اسلامی سوشلسٹ ممالک میں بھی ہمارے کارکن خفیہ طور پر کام کر رہے ہیں۔

(روزنامہ امروز - ۶ نومبر ۱۹۷۲ء)

اپنے طریق کار کے متعلق میاں صاحب نے ناصر باغ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا صرف ہمارا حق نہیں بلکہ ہمارا دینی اور قومی فریضہ ہے اور ہم نفرت پھیلانے سے باز نہیں آئیں گے۔

(مساوات - ۲۶ اگست ۱۹۷۳ء)

اصل یہ ہے کہ مودودی صاحب جمہوریت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی تھی کہ یہ لوگ پاکستان میں جمہوری نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اور :-

جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ (ترجمان القرآن - محرم ۱۳۶۰ھ ہجری ص ۲۹)

وہ اکثریت کی حکومت کے بھی قائل نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اُسی زمانے میں کہا تھا :-

جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی۔ مگر اس نے سترہ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت تین لاکھ تھی۔ مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گذر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانے کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسی طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے۔

(ترجمان القرآن - ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ہجری - ص ۴۸)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ یہ جماعت، انتخابات ہی نہیں بلکہ حصولِ اقتدار کے سلسلہ میں کس قدر متضاد نظریات کی حامل ہے۔ اگر وہ ان نظریات کو کھلے بندوں سیاسی حربوں کے طور پر استعمال کرے تو کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ دورِ حاضرہ کی سیاست میں، جس حربہ سے بھی حصولِ مقصد میں کامیابی ہو جائے وہ "جائز" قرار پا جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ جماعت ہر متضاد نظریہ کے متعلق دعویٰ کرتی ہے کہ وہ عین مطابقِ اسلام ہے۔ اس سے دنیا میں اسلام کی جس قدر رسوائی ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اور اسلام کی رسوائی ہی کا احساس ہے جو ہمارے لئے باعثِ سوہانِ روح بنتا ہے۔

(۰)

۳۔ قرآنِ کریم اور معاشرتی مسائل

قرآن مجید ایک عظیم، محیط کل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں جہاں کائنات کے مستور حقائق اور قوموں کے

عروج و زوال کے غیر متبدل قوانین دیئے گئے ہیں وہاں انسانی معاشرتی زندگی سے متعلق ایسی ہدایات بھی بیان کی گئی ہیں جو سطحی نگاہوں سے دیکھنے والوں کے نزدیک بڑی معمولی سی ہیں ـــــ ایسی معمولی کہ ان کے نزدیک انہیں وحی کی رُو سے عطا کئے جانے کی چنداں ضرورت نہ تھی ـــــ لیکن اگر انہیں روزمرہ زندگی کے تجربہ کی روشنی میں ذرا گہری نظروں سے دیکھا جائے تو ان کی اہمیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آج کی نشست میں ہم ان میں سے دو ایک ہدایات کو سامنے لاتے ہیں جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرہ میں بہت سی اُلجھنیں اور بدمزگیاں پیدا، اور پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ جن حضرات کو ان پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ ان کی اہمیت کو نمایاں کرنا بڑا ضروری ہے۔

ان میں سے پہلی ہدایت یہ ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا ۲۴/۲۷

اے جماعتِ مؤمنین! جب تم اپنے گھر کے علاوہ کسی اور کے ہاں جاؤ تو پہلے ان سے اجازت طلب کرو اور جب وہ اجازت دیں تو پھر اندر جاؤ۔

اس کے بعد ہے :-

فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ۲۴/۲۸

اور اگر تم دیکھو کہ اس گھر میں کوئی نہیں تب بھی اس کے اندر نہ جاؤ۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ آپ اس وقت واپس تشریف لے جائیں تو دل میں کوئی گرانی لائے بغیر واپس آجاؤ۔

ان ہدایات میں کہا تو یہ گیا ہے کہ کسی کے ہاں بلا اجازت مت جاؤ، لیکن وسیع پیمانے پر اس سے مراد یہ ہے کہ کسی سے ملنے کے لئے جانا ہو تو پہلے وقت مقرر کرو۔ یعنی (BY APPOINTMENT) جاؤ۔ یونہی جب جی چاہے کسی سے ملنے کے لئے نہ چلے جاؤ۔ اگر کسی کے ہاں اتفاقیہ جانا پڑے تو بھی اہلِ خانہ سے پہلے پوچھ لو کہ انہیں ملنے کے لئے وقت ہے۔ اور اگر وہ معذرت کر دیں تو اس کا بُرا نہ مناؤ۔ واپس چلے آؤ۔

مغربی ممالک میں چونکہ وقت کی قیمت کا بڑا احساس ہے اس لئے انہوں نے اپنے اوپر اس پابندی کو بڑی شدت سے عائد کر رکھا ہے۔ وہاں پہلے سے وقت مقرر کئے بغیر کوئی کسی کے ہاں نہیں جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں (جنہیں خدا کے ہاں سے یہ ہدایت ملی تھی) کیفیت یہ ہے کہ جب کسی کا جی چاہے ملنے کے لئے چلا آتا ہے۔ اس سے دوسرے کے کام، وقت اور مصروفیات میں جس قدر حرج واقع ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں اس قسم کے ملاقاتیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اوّل تو وہ اس کی جرأت نہیں کر سکتے کہ اس آنے والے سے کہہ دیں کہ اس وقت معاف فرمایئے۔ اور اگر وہ کہیں اس کی جرأت کر لیں تو آنے والے صاحب اس کا اتنا بُرا مناتے ہیں کہ بعض اوقات ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس بدمزگی سے بچنے کے لئے اہلِ خانہ کو اکثر اوقات جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ یہ وبا ہمارے ہاں عام ہے اور نتیجہ ہے اس قرآنی ہدایت کو نظر انداز کر دینے کا۔

۲۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ آنے والے صاحب بلا اطلاع چھپا چھپ گھر کے اندر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے اہلِ خانہ کی پرائیویسی میں جس قدر خلل واقع ہوتا ہے ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ .... (۳۳/۵۳) "اور اگر تمہیں نبی کے گھر سے کوئی چیز لینی ہو تو اس کے لئے بھی یونہی بے محابا اندر نہ چلے جایا کرو۔ قاعدے کے مطابق پردے کے باہر سے اسے مانگا کرو" ظاہر ہے کہ اس حکم کا اطلاق بھی عام ہے کہ بلا اطلاع دیئے اور اجازت لئے کسی کے مکان کے اندر نہ چلے جایا کرو۔ اہلِ یورپ کے ہاں اس کی بھی پابندی ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ (ہم سے ہمارے بڑے بوڑھے اچھے تھے کہ وہ خود اپنے گھر میں بھی آتے تو ڈیوڑھی میں کھنکار کر اندر آتے)۔

(۳) ہمارے ہاں اگر دو چار دوستوں یا عزیزوں کو کھانے پہ بلایا جائے تو اہلِ خانہ کا پورے دن کا پروگرام ملیٹ ہو جاتا ہے۔ کچھ تو (دوپہر کے کھانے کے لئے) بارہ ہی بجے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور بعض تین تین بجے تک تشریف نہیں لاتے اور باقی سب ان کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر کھانے کے بعد جو محفل جمتی ہے تو کوئی اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں یہ ہدایت دی گئی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ ...... (۳۳/۵۳)

اے جماعتِ مؤمنین! تم یونہی بن بلائے اور بغیر اجازت لئے رسولؐ کے گھر نہ چلے جایا کرو۔ اگر وہ تمہیں کھانے کے لئے بلائے تو اس کے ہاں جاؤ۔ لیکن وہ بھی اس طرح نہیں کہ تم کھانا پکنے سے پہلے ہی وہاں جا بیٹھو اور کھانے کا انتظار کرتے رہو جب کھانا تیار ہو جائے اور وہ تمہیں بلائے تو پھر اندر جاؤ۔ اور جب کھانا کھا چکو تو وہاں سے چلے آؤ۔ وہیں بیٹھے باتوں میں نہ لگ جاؤ۔

اہلِ مغرب اس پابندی پہ بھی عمل کرتے ہیں اور بڑے سکھ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے تو خود اپنے گھروں میں بھی کھانے کے اوقات مقرر کر رکھے ہیں اور اس .... کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات کہی ہے جو متعین طور پہ تو رسول اللہؐ سے متعلق ہے لیکن وہ ترجمانی کرتی ہے ہم میں سے ہر ایک کے دل کی۔ فرمایا:۔ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ .... (۳۳/۵۳) "تمہاری موجودہ روش سے رسولؐ کو بڑی اذیت پہنچتی ہے لیکن وہ شرم کی وجہ سے تمہیں کچھ کہتا نہیں، لیکن اللہ تو حق بات کہنے سے نہیں شرماتا (اس لئے اس نے یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے)

ان ہدایاتِ خداوندی کی مزید تشریح اور تصریح کی ضرورت نہیں۔ اے کاش! ہم قرآن مجید کی ان چھوٹی چھوٹی ہدایات پہ ہی عمل پیرا ہوتے تو کتنے آرام سے رہتے!

(قسط ۶)

احتساب

(قسط ۵ گذشتہ مارچ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی قسط ۶ اب پیش ہے)

۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل پاکستان نے اختیاراتِ خصوصی سے کام لیتے ہوئے مجلس دستور ساز کو ختم کر دیا، اور مملکتِ پاکستان ہنگامی صورتِ حال سے دوچار ہو گئی۔ فیڈرل کورٹ کے فیصلوں کے بعد گورنر جنرل نے دستورِ مملکت کی از سرِ نو تسوید اور وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام کے لئے انتظامی اقدامات کا آغاز کیا۔ پاکستان اپنی زندگی کے ایک نئے اور نازک موڑ میں داخل ہو رہا تھا اور "طلوعِ اسلام" کو ان عظیم ذمہ داریوں کا بخوبی احساس تھا جو قرآنی فکر کے نقیب اور داعیٔ انقلاب کی حیثیت سے اس پر عائد ہو رہی تھیں۔ چنانچہ "ہنگامی حالات کے بعد" کے عنوان سے اس نے اپنی ۹ اپریل ۱۹۵۵ء کی ہفتہ وار اشاعت میں جو افتتاحیہ سپردِ قلم کیا اس میں وحدتِ مغربی پاکستان کی تحریک کی حمایت کرتے ہوئے لکھا:۔

وحدتِ مغربی پاکستان

"ہمارا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ فلاں فلاں صوبہ ہمیں دے دو۔ مطالبہ یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان سے الگ کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا حتیٰ کہ پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں سے بھی ہمیں وہی علاقہ ملا جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس سے واضح ہے کہ صوبوں کی لکیریں پاکستان کے مطالبہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ لیکن اربابِ سیاست کی اغراض شئومہ نے ملّت پر ان علاقائی لکیروں کو مقدم بنا دیا۔ اور صوبوں کی انتظامی حد بندیوں کو قلوب و اذہان میں اس طرح جاگزیں کر دیا کہ ایک ملّت کہلانے والے مسلمان اپنے آپ کو سندھی، بنگالی، پنجابی، پٹھان اور کیا کیا کچھ کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے، نسلی اور صوبائی تعصب کی یہی آگ تھی جس نے سارے پاکستان کو جہنم میں تبدیل کر دیا اور آئین کی تسوید کو، جو آزاد و مہذب ملک کا پہلا لازمہ ہوتا ہے، اُلجھا اُلجھا کر بھول بھلیاں بنا دیا۔ ہم نے بارہا یہ لکھا ہے کہ جغرافیائی یا انتظامی حد بندیاں سہولت یا تعارف کی غرض سے ہوتی ہیں۔ لیکن اگر وہ یہاں تک دل نشین ہو جائیں کہ دلوں میں بھی حد بندیاں قائم ہو جائیں اور قوم ان اضافی نسبتوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے تو یہی حد بندیاں انتہائی مذموم ہو جاتی ہیں، اور اس قابل کہ انہیں حرفِ غلط کی طرح محو کر دیا جائے۔ پاکستان میں تخریبی عناصر نے ان لکیروں کو خوب اچھالا ہے اور ان کے نام پر جسدِ سیاست میں بڑا خطرناک زہر داخل کر دیا ہے۔"

(طلوعِ اسلام - ۹ اپریل ۱۹۵۵ء - صفحہ ۴-۳)

مجرمانہ تغافل

انہی ایّام میں کابل کے پاکستانی سفارت خانے کے خلاف اشتعال انگیزی سے کام لیا گیا۔ اور غنڈہ گردی کی انتہا یوں ہوئی کہ کابلی حکمرانوں کی شہ پر نہ صرف سفارت خانے پر منظم حملہ کیا گیا بلکہ جھنڈا تک پھاڑ دیا گیا۔ طلوعِ اسلام نے "کابل کی اشتعال انگیزی کے

زیرِ عنوان حکومتِ پاکستان کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:۔

> ہمیں افسوس ہے کہ ہماری حکومت نے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔ ہمارے نمائندے جو کابل میں متعین ہوتے رہے وہ عموماً پبلک میں یہی بیان دیتے رہے ہیں کہ افغانستان سے ہمارے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں اور اب یوں ہو جائے گا اور یوں ہو جائے گا۔ خود موجودہ سفیر کرنل شاہ نے بھی اس سلسلہ میں بڑی امیدیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اگر ہمارے نمائندے اس غلط فہمی میں دیانتداری سے مبتلا رہے تو یہ ان کی سطح بینی اور کم نظری کا ثبوت ہے۔ اور اگر مصلحتاً انہوں نے قوم کو تصویر کا روشن رخ دکھایا۔ لیکن حکومت کو صحیح حالات سے باخبر رکھا تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ حکومت نے مجرمانہ تغافل سے کام لیا۔ اور بروقت اصلاحِ احوال کے لئے کچھ نہیں کیا۔
>
> (شمارہ ۹ راپریل ۱۹۵۵ء ۔ صـ۶ـ)

خارجہ پالیسی

۱۶ راپریل ۱۹۵۵ء کا طلوعِ اسلام "پاکستان کی فارن پالیسی" کے عنوان سے اہم افتتاحیہ لے کر سامنے آیا۔ اس نے بین الاقوامی واقعات و حقائق کی روشنی میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بھرپور جائزہ لیا اس کے ہر گوشے سے نقاب الٹا۔ اس کے نتائج و عواقب کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی۔ اور اس تفصیل کے دوران میں اس تلخ حقیقت کو صاف اور واشگاف انداز میں بایں الفاظ دہرایا کہ:۔

> سطورِ بالا سے یہ تشویشناک صورت سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی عالمِ اسلامی میں کوئی ساکھ نہیں۔ برطانیہ اس کا دوست نہیں۔ امریکہ اس کے حق میں کھلم کھلا ووٹ دینے کے لئے تیار نہیں۔ گویا دنیائے سیاست میں وہ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہے۔ اس کی یہ تنہائی ایسے عالم میں ہے کہ روس اور امریکہ جیسے ممالک بھی تنہا رہنے کا تصوّر نہیں کر سکتے ...... کوئی اور ملک اس قدر تنہا ہوتا تو شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا۔ کیونکہ اس سے اس کی بقا معرضِ خطر میں پڑ جاتی۔ لیکن ہمارے اربابِ حکومت یوں مگن ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ یہ تنہائی دوسری قوموں سے ہٹ کر اور علیحدہ رہنے کے باعث نہیں۔ پاکستان تقریباً وہ سب کچھ کرتا رہا ہے جس سے اسے دیگر اقوام کی حمایت اور دوستی میسّر آئے۔ لیکن اس کے باوصف نتیجہ وہ نکلا، جو آپ ہمارے سامنے ہے۔
>
> (شمارہ ۱۶ راپریل ۔ صـ۴ـ)

ہماری فروگذاشت

ایسا کیوں ہوا؟ یہ ہماری زندگی اور موت سے متعلق اہم ترین سوال تھا۔ طلوعِ اسلام نے اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے بڑی وضاحت سے لکھا:۔

> اس حیثیت سے پہلے ہی دن ہمیں یہ طے کر لینا چاہیئے تھا کہ بین الاقوامی سیاست میں ہمارا کردار کیا ہوگا؟ یعنی ہماری فارن پالیسی کیا ہوگی؟ لیکن، ایسا نہیں کیا گیا اور ہوتا بھی کیسے!

اس کے لئے یہ شعور ضروری تھا کہ ہمارے مقاصد کیا ہیں اور بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں ان کے حصول کی کونسی مناسب صورت ہے۔ اگر مقاصد واضح طور پر ہمارے سامنے ہوتے تو وہ ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں مدد دیتے کہ عالمی بساط پر کون ہمارے دوست ہیں۔ ان کی مدد کیسے کی جاسکتی ہے اور ان سے مدد کیسے لی جاسکتی ہے۔ ہم نے فارن پالیسی کا بدل لمبی چوڑی تقریروں کو سمجھ لیا جن میں حق و انصاف۔ انسانیت۔ آزادی وغیرہ بلند اقدار پر خطبے دیئے جاتے تھے۔ دوسری قومیں ہمارے یہ خطبے سنتی تھیں اور سر ہلاتی تھیں کیونکہ ان اقدار سے کسی کو انکار نہیں تھا...... لیکن جب معاملہ رائے شماری کا آتا تو فیصلہ کچھ اور ہوتا تھا۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ آجکل کی آزاد قومیں اقوام متحدہ میں شریک ہیں تو اپنے اپنے ملکی مفاد کی خاطر۔ وہ اسی بنا پر دوسری اقوام سے تعاون کرتی ہیں اور اُسے کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ اس کے برعکس پاکستان نے نہ اپنا مفاد متعین کیا، نہ دوسروں کا مفاد سمجھا اور نہ کوئی باہمی تعاون کی شعوری کوشش کی...... یہ تو غنیمت ہوا کہ اس دوران میں کوئی بین الاقوامی تصادم ایسا نہیں ہوا جس میں قومیں ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہو جاتیں۔ ایسا ہوتا تو ہمیں نظر آجاتا کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں

(ایضاً)

حل کیا ہے؟

اس مایوس کن صورتِ حال کی تفصیل پیش کرنے کے بعد طلوعِ اسلام، پاکستان کی خارجہ پالیسی کے نقوش و خطوط متعین کرتا ہے اور لکھتا ہے:۔

نقشے پر دیکھنے سے یہ حقیقت بآسانی سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان کے قدرتی دوست، وہ مسلمان ممالک ہیں جن کا سلسلہ مغربی پاکستان سے شروع ہو کر ایک طرف ترکی تک جاتا ہے اور دوسری طرف سویز کو عبور کرتا ہوا مغرب اقصیٰ کے انتہائی کونوں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ علاقے پاکستان سے ملحق بھی ہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے باشندوں کے درمیان قلبی روابط بھی ہیں۔

اس نشان دہی کے بعد وہ مسلم ممالک کی داخلی سیاسیات اور پاکستان دشمن ممالک کے پیدا کردہ عوامل کا پورا پورا تجزیہ کرتا ہے۔ اور تفصیلاً بتاتا ہے کہ ان ممالک نے پاکستان کے خلاف مسلم ممالک میں کس قسم کا زہریلا پروپیگنڈہ جاری کر رکھا ہے اور دوسری طرف پاکستان کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

پاکستان نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اس کا کچھ تدارک نہ سوچا۔ جہاں ہندوستان نے اپنے اہل ترین اور عیار ترین نمائندے ان ممالک میں بھیجے وہاں پاکستان نے بڑی غفلت اور بے خبری کا مظاہرہ کیا۔ ہمیں نام لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن گذشتہ آٹھ سالوں میں جو پاکستانی سفیر اسلامی ممالک میں بھیجے گئے انہوں نے فضا کو اور خراب کیا۔ غالباً ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اگر ایک طرف ان نمائندوں میں تدبر کا فقدان اور جذبۂ صحیح کا افلاس تھا تو دوسری طرف خود حکومت پاکستان کے سامنے کوئی متعین پالیسی نہیں تھی جس پر ہمارے نمائندے عمل پیرا ہوتے۔

(ایضاً۔ صـ)

اس کے بعد طلوعِ اسلام خارجہ پالیسی کی ناکامی کی مثالیں پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ بین الاقوامی اداروں میں ہندوستان اپنے سربسر غلط مؤقف کی تائید حاصل کر لیتا ہے لیکن حق و صداقت پر مبنی ہونے کے باوجود پاکستان کو امریکہ جیسے دوستوں کی تائید بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے؟ طلوعِ اسلام اس کے جواب میں حقیقت کی یوں نقاب کشائی کرتا ہے۔

ہم اسے دُہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ فارن پالیسی محض اعلیٰ اخلاق یا انسانی اقدار کا واسطہ دے کر التجائیں کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو مؤثر بنا کر دوسرے ممالک کی عملی حمایت حاصل کرنے کا نام ہے......... اس پالیسی کا مطلب بین الاقوامی میدان میں معتمد دوست پیدا کرنا ہے۔ پاکستان ایسا نہیں کر سکا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اعلیٰ اخلاق اور انسانی اقدار کو خیرباد کہہ کر دوسروں کی دوستی حاصل کی جائے۔ ہم یقیناً اس اندازِ سیاست کے کھلے ہوئے دشمن ہیں اور پاکستانی قائدین کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ وہ اپنی پالیسی کو ان اقدار سے علیحدہ کر لیں۔ ہم نے پاکستان حاصل ہی اس لئے کیا ہے کہ اخلاقی اقدار کی عظمت کو برقرار رکھا جائے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ محض بلند اصولوں کی مالا جپتے رہنے سے سب کچھ حاصل نہ ہوگا۔ (ایضاً)

نمائشیں ہی نمائشیں

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں اور بالخصوص دارالسلطنت کراچی میں سرکاری طور پر نمائشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع تھا۔ اور یہ ساری رنگ رلیاں اس مملکت میں جاری تھیں جس کے لاکھوں افراد روٹی، کپڑے اور رہائش کے لئے مکان تک سے محروم تھے۔ اس مضحکہ خیز صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

یوں تو پاکستان کی آٹھ سالہ زندگی کو سمٹا کر سامنے لایا جائے تو اس کی صحیح تعبیر کے لئے ایک لفظ "نمائش" کافی ہوگا ـــــ علم و حکمت کی اس مہرہ بازی میں، بحث و تکرار کی نمائش ـــــ مکتب و مدرسہ میں پرانے افکار کی نمائش، معاشیات و اقتصادیات میں خطوطِ خمدار کی نمائش ـــــ مریز و کجدار کی نمائش ـــــ سیاسیات میں، ہوس کی خونریزیاں چھپانے کو، عقلِ عیار کی نمائش....

یہ نمائشیں کیوں قائم کی جا رہی ہیں؟ اس لئے کہ امریکہ میں اس قسم کی نمائش گاہیں قائم ہیں۔ یہ کچھ لکھنے کے بعد طلوعِ اسلام عوام کے دل کی دھڑکنوں کا نقیب بن کر سامنے آتا ہے۔ اور لکھتا ہے:۔

اگر ہمارے ملک میں کوئی باہوش طبقہ ایسا ہے جس کی آواز ان محلاتِ شاہی میں بسنے والوں کی خوابگاہوں تک پہنچ سکتی ہے تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ان حضرات کے کانوں تک زمانہ کی یہ تلخ حقیقت پہنچا دیں کہ بھوکے کا پیٹ روٹی سے بھرتا ہے۔ چولھے۔ چمٹے۔ توے پرات کے نقشوں سے نہیں بھرتا۔ قوم ایک ایک پیسے کو ترس رہی ہے۔ لاکھوں انسان زندگی کی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو رہے ہیں۔ اور ہمارے یہ، تخیلات کی جنتوں میں بسنے

والے اربابِ نظم ونسق ہیں کہ لاکھوں روپیہ نمائش گاہوں کی تعمیر . . . پر صرف کرنے کی سوچ رہے ہیں اور سوچ اس لئے رہے ہیں کہ " امریکہ میں ایسی نمائش گاہیں بنی ہوئی ہیں " انہیں کون بتائے کہ امریکہ کی دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ اسے (دنیا بھر کے گداگروں کی جھولیاں بھرنے کے بعد) لاکھوں من اشیائے خوردنی سمندر میں ڈبونی پڑتی ہیں

(شمارہ - ۷ رمئی ۱۹۵۵ء - صہ ۶)

پاکستان کا دل

قائداعظمؒ نے بارہا پنجاب کو "پاکستان کا دل" قرار دیا تھا لیکن اسی پنجاب میں محلاتی سازشوں کے جو ڈرامے کھیلے گئے اور کھیلے جا رہے تھے اس کی زہرانگیزیوں سے پورے پاکستان کی فضا مسموم ہوئی جا رہی تھی۔ طلوع اسلام ایک عرصہ تک اس ڈرامہ کو مہر بلب دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک دن اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ ۲۸ رمئی ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں اس نے اپنے جگر سوز افتتاحیے میں دل کے زخم صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے اور لکھا:-

قائداعظمؒ کی زندگی میں ہی اربابِ سیاست کی خانہ جنگی اس قدر گھناؤنی ہو گئی تھی کہ ان کی مساعیٔ مفاہمت یکسر ناکام ہو گئیں۔ قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد جو دور شروع ہوا اس کا دارومدار ہی ریشہ دوانی اور سازش پر تھا۔ اس پر پاکستان کے دل پر دورے پر دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ اگر آج تک یہ دل حرکت کرتا رہا ہے تو اس کی یہ غیر معمولی سخت جانی کی نشانی ہے۔ مرض کی شدت کی کمی کا ثبوت نہیں ...... برطرف شدہ مجلس دستور ساز نے ایسی بساط بچھائی کہ وزارتوں کے بندے۔ عہدوں کے بھوکے اور ملک کے دشمن اپنے اپنے سروں پر سازشوں کے جالوں کے پشتارے لادے کراچی میں آموجود ہوئے۔ سیاست کی اسٹیج پر سات سال سے جو ڈراؤنا ڈراما کھیلا جا رہا تھا یہ اس کی داستانِ جگر گداز کا انتہائی نقطہ (CLIMAX) تھا۔ مملکتِ پاکستان سازشوں کے گراں بار بوجھ کے نیچے دب کر دم توڑ رہی تھی اور روحِ پاکستان زبانِ حال سے پکار رہی تھی ؎

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل   چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

افتتاحیہ - ۲۸ رمئی ۱۹۵۵ء

مجلسِ دستور ساز کے خاتمے کے بعد امید کی ایک نئی کرن ابھری۔ وحدتِ مغربی پاکستان کا منصوبہ ایک صبحِ نو کا عنوان بن کر سامنے آیا۔ لیکن جلد ہی یہ تابناک فضا تاریکیوں کی زد میں آگئی۔ طلوع اسلام کے الفاظ میں سنیئے:-

ملک میں تذبذب کا دور ختم ہوتا جا رہا تھا اور یقین و اتحاد کی فضا پیدا ہو رہی تھی کہ پھر سے مرحب و عنتر اٹھے۔ اس وقت پتہ چلا کہ میدان میں کوئی اسد اللہ نہیں۔ جسے دیکھئے جادوئے سامری کا ہلاک اور شیوۂ آذری کا قتیل۔

اس سے سپیدۂ سحر، صبح کاذب میں تبدیل ہوگیا۔ اور پھر سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھانے لگا۔ سندھ سے آواز اٹھی کہ آئین ساز کنونشن کے لئے صرف سندھی منتخب ہوں گے۔ سرحد نے کہا کہ ہم بھی کسی "باہر" کے غیر سرحدی کا نام نہیں لیں گے۔ یہ وہی اسمبلیاں تھیں جو چند دن پہلے یہ بلند بانگ قرارداد یں پاس کر چکی تھیں کہ پاکستان جس مکروہ صوبائیت کا شکار ہے اس کا علاج یہ ہے کہ صوبوں کو یک قلم ختم کر دیا جائے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ صوبوں کی حدیں سطح ارض پہ نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں تھیں۔ مٹی کی لکیریں مٹا دینے سے دلوں کی لکیریں نہیں مٹ سکتیں۔ اس کے لئے ضرورت تو یہ ہے کہ ان دلوں میں چھری چبھو دی جائے اور اگر پاکستان کو بحیثیت پاکستانی باقی رہنا ہے تو ان دلوں میں ہی چھری نہیں چبھونی ہوگی بلکہ جن سینوں میں یہ دل ہیں ان سینوں کو خنجر سے شق کر دینا ہوگا۔۔۔۔۔۔

ہمارے نزدیک پاکستان کی بقا تمام امور پہ مقدم ہے، بشرطیکہ ان امور میں کوئی چیز قرآن کے خلاف نہ ہو۔۔۔۔۔۔ ہماری ملی زندگی کا دارومدار پاکستان کی زندگی پر ہے۔ پاکستان باقی رہا تو ہم بھی باقی رہیں گے اور پاکستان ڈوبا تو ہم بھی غرق ہو جائیں گے۔ اور وزارتوں و عہدوں کی وہ ساری کرسیاں بھی گرداب ہلاکت کی نذر ہو جائیں گی۔ جن کی خاطر اس وقت کتوں کی طرح لڑائی لڑی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ مرکز پر اعتماد کا اظہار کر کے اور وحدت کا نام لے کر ملک اور قوم کو دھوکا دینے والے ننگے ناچ رہے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ)

اور اس کے بعد خون کے آنسو برساتے ہوئے طلوع اسلام نے صورت حال پر یوں نوحہ خوانی کی:۔

یہ بھی دیکھئے کہ یہ حامیانِ افتراق و دشمنانِ وحدت سب کے سب مسلم لیگ کے ارکان ہیں۔ اگر ان میں ملکی شعور اور ملی سلیقہ نہیں تو سا منے ہی ان میں پارٹی ڈسپلن کا شائبہ تک نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ ان سے اپیل کریں تو کس نام پر اور واسطہ دیں تو کس کا؟ یہ خود سات سال سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے چلے آرہے ہیں کہ مسلم لیگ قائداعظمؒ کا مقدس ترکہ ہے۔ لیکن انہیں کیسے بتایا جائے کہ اگر قائداعظمؒ کی مسلم لیگ پاکستان کو عدم سے وجود میں لائی تھی تو ان کی مسلم لیگ پاکستان کو وجود سے عدم کی طرف لے جا رہی ہے۔ آج اگر قائداعظمؒ بھی ان اخلاف کو دیکھ لیں تو وہ یقیناً ان سے برأت اور بیزاری کا اعلان کر دیں۔ لیکن قائداعظمؒ آنے سے رہے اور یہ اعلانِ بے تعلقی ہونے سے رہا۔ اس کا پتہ اس وقت چلے گا جب فطرت کے قانونِ مکافات کے مطابق ظہور نتائج کا وقت آئے گا۔ اور وہ ان کی ایک ایک سیہ کاری ان کے سامنے آ جائے گی۔ اس وقت آپس میں بیکار باتوں پر لڑنے کو مقصودِ زندگی سمجھنے والے "قسطنطنیہ کے یہ پادری" روئیں گے اور کہیں گے ـــــــ یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیاً۔

(ایضاً)

مسئلۂ کشمیر انہی ایام میں وزیراعظم پاکستان نے دہلی پہنچ کر مسئلہ کشمیر سے متعلق وزیراعظم ہند سے مذاکرات کئے۔ وزیراعظم پاکستان نے واپسی پر ان مذاکرات کے بارے میں پاکستانی عوام کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جو صورتِ حال سامنے آئی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "مذاکراتِ کشمیر" کے عنوان سے طلوعِ اسلام نے لکھا:-

.... لیکن اس کے باوجود پنڈت جی نہ مانے۔ وہ مانتے بھی کیسے؛ وہ تو ایک ہی بات مان سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ پاکستان اپنے آپ کو ان کے قدموں میں ڈال دے۔ ہمارے وزیراعظم ابھی یہاں تک نہیں پہنچے لیکن جس طریق سے وہ سنہ ۱۹۵۳ء سے اپنے "بڑے بھائی" کے سامنے رفتہ رفتہ ہتھیار ڈالتے جا رہے ہیں، اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایک دو ملاقاتیں اور ہوئیں تو یہ پیش کش بھی کر دی جائے گی.......... ہم وزیراعظم صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اگر آپ نے (بقول آپ کے) پنڈت نہرو کو واقعی قریب سے دیکھا ہے تو کیا پھر بھی آپ کی آنکھیں نہیں کھلیں؟.......... ہم وزیراعظم سے بادب گزارش کریں گے کہ کشمیر ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ہندوستان اس پر معقول بات کرنے اور سننے کو تیار نہیں تو اس سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ رکھا جائے.......... ایسے ملک سے دوستی اپنے آپ سے دشمنی ہے جو ہماری شاہ رگ پر قابض ہے لیکن ہمیں جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔

ہم وزیراعظم سے یہ بھی گزارش کریں گے کہ وہ ازراہِ کرم قوم کو صاف صاف بتائیں کہ وہ دہلی میں کیا کر کے آئے ہیں۔ اگر وہ قوم پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تو انہیں قوم سے بھی جوابی تعاون کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ انہوں نے اپنے بیان میں پریس سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کے بارے میں تعاون کرے۔ ہم حیران ہیں کہ ہم سے کس قسم کے تعاون کی توقع کی جا رہی ہے؛ کیا ہم کشمیر کو ذبح ہوتے دیکھیں اور لب کشائی نہ کریں؟ اگر تعاون سے مراد یہ کچھ ہے تو ہم مجبور ہیں کہ اس اپیل پر مطلقاً کان نہ دھریں۔ آپ اس قسم کا تعاون پتھروں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ذی احساس انسانوں سے نہیں۔ (شمارہ ۲۸ مئی سنہ ۱۹۵۵ء ص ۶)

شرمناک ہنگامہ نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے سلسلے میں پنجاب کے سیاسی کرم فرما جن شرمناک ہنگامہ آرائیوں پر اُتر آئے تھے وہ ملک کے مستقبل کے لئے تباہی کا پیش خیمہ تھیں۔ طلوعِ اسلام کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس صورتِ حال کو خاموشی سے گوارا کر لیتا۔ اس نے پہلے مختلف لیڈروں کی باہمی آویزش اور جنگجوئی کی اخباری رپورٹ کو "بطورِ نمونہ" پیش کیا اور پھر "نوحۂ محشر" کے عنوان کے تحت لکھا:-

یہ نمونہ ہے گالی گلوچ کے اس گھناؤنے کھیل کا۔ جس میں پنجاب کے قائدین مصروف ہیں۔ یہ ڈرامہ کیوں کھیلا جا رہا ہے۔ آخر یہ بیٹھے بیٹھے کیا ہو گیا کہ اس حمام میں سبھی ننگے نظر آ رہے ہیں؟

یہ شرمناک ہنگامہ صرف اس بات پر اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ پنجاب کو مجلسِ دستور ساز کے لئے نمائندے منتخب کرنے ہیں۔ دیوانے کی بڑ کی طرح، بات جب چل نکلی ہے تو کسی کے منہ سے کلمۂ خیر نہیں نکلتا۔ اِس کے نزدیک وہ غدّار۔ اُس کے نزدیک یہ مردودِ ازلی۔ یہ کیا عذاب مسلّط ہو گیا کہ ہر شخص آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی بجائے دوسرے کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ رہا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ سبھی صورتیں مسخ ہو گئی ہیں اور ہر شخص حبشی کی طرح آئینے میں اپنا ہی چہرہ دیکھ رہا ہے۔ لیکن سمجھ رہا ہے کہ اس میں شیطان بیٹھا ہے۔

ہمیں رونا ان مسخ شدہ چہروں کا نہیں بلکہ ماتم اس کا کرنا ہے کہ یہی سیاہ چہرے کل کو ایک جگہ جمع ہوں گے تو اپنے آپ کو مجلسِ دستور ساز کا نام دیں گے اور ان کے ذمہ فریضہ یہ ہو گا کہ وہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے لئے شایانِ شان دستور مرتب کریں ؎

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک
سر برآرد ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

(شمارہ ۴ جون ۵۵ء۔ صفحہ)

اس کے بعد طلوعِ اسلام کسی قدر تفصیل سے اربابِ سیاست کی طالع آزمائیوں کی تصویر پیش کرتا ہے اور اس ضمن میں لکھتا ہے:۔

وزارتیں چلتی پھرتی چھاؤں ہوتی ہیں۔ وہ بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ نہ ان کے آنے کی خوشی ہونی چاہیئے نہ جانے کا غم۔ کیونکہ۔ ؏

امم را از شہاں پائندہ تر داں

کے مصداق دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس آمد و رفت میں ملک اور قوم کا کیا بنتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں سیاسیاتِ پاکستان کا جائزہ لیجئے تو یہ رنجیدہ حقیقت روح کی گہرائیوں میں لرزہ برپا کر دیتی ہے کہ بساطِ سیاست پر چند شاطر بیٹھے ہیں جو جوڑ توڑ اور ہار جیت میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے ذاتی مصالح اور شخصی مفادات کے مطابق ملک کی قسمت کے پانسے پلٹتے رہتے ہیں اور اگر ملکی سیاست ہر وقت متزلزل اور تعاون نا آشنا رہتی ہے تو کسی اساسی خرابی کی بدولت نہیں۔ بلکہ محض انہی اصحابِ غرض و اربابِ ہوس کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے اور یہ ریشہ دوانیاں محض اس وجہ سے نہیں ہو رہیں کہ ہمارے سیاست دان جاہ و منصب کے بھوکے ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کی طرف سے ان پر کسی قسم کا احتساب نہیں۔ ہر ابن الوقت مفادِ خویش کا تحفظ کرتا ہے اور اسے تقاضائے ملّی قرار دیتا ہے۔ (ایضاً)

―――(۰)―――

باسمہٖ تعالیٰ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

دین اور مذہب کی کشمکش

(تاریخِ انسانیّت کا اہم ترین باب)

پرویز

باسمہٖ تعالیٰ

دین اور مذہب کی کش مکش

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشنوں میں، پرویز صاحب کے خطابات، تحریکِ فکرِ قرآنی کے سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گذشتہ دو سالوں (۱۹۷۷ء و ۱۹۷۸ء) میں ملکی حالات میں عدمِ سکون کی وجہ سے کنونشنیں منعقد نہ ہو سکیں تو پرویز صاحب کے خطابات کی کمی خاص طور پر محسوس کی گئی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے احباب نے تقاضا کیا کہ سابقہ کنونشنوں کے بعض خطابات دوبارہ شائع کر دیئے جائیں تاکہ قرآنی فکر کا جذبہ بدستور بیدار رہے۔ اس تجویز کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کے بعض خطابات ہدیۂ قارئین کئے گئے جن سے فضا خاصی متاثر ہوئی۔ اس سے دو ایک اہم نکات بھی سامنے آئے۔ ایک تو یہ کہ ان خطابات و مقالات کی حیثیت، اخباری خبروں کی سی نہیں جن کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے۔ یہ جن موضوعات سے متعلق ہوتے ہیں ان کی اہمیت مستقل حیثیت رکھتی ہے اس لئے یہ کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ طلوعِ اسلام کا حلقۂ قارئین دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اس لئے ان "نو واردانِ بساطِ ہوائے دل" کے لئے یہ خطابات تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی ان کی اہمیت میں کمی واقعہ نہیں ہو جاتی۔

امسال ارادہ تھا کہ اپریل (۱۹۷۹ء) میں کنونشن منعقد کر لی جائے لیکن فضا میں اب بھی وہ سکون نہیں جو ان کنونشنوں کے انعقاد کی شرطِ اوّلیں ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کوئی سیاسی تحریک نہیں جسے ہنگامہ خیز فضا زیادہ راس آتی ہے۔ یہ خالصتہً فکری تحریک ہے جس کے لئے قلبی اطمینان اور ذہنی سکون لاینفک ہے۔ بنا بریں، فی الحال اس کنونشن کا انعقاد ممکن نہیں۔ پرویز صاحب کے خطاب کی کمی پورا کرنے کے لئے ہم (حسبِ سابق) ان کا ایک سابقہ خطاب (بادنیٰ تغیّر) شاملِ اشاعت خاطر کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ خطاب ۱۹۶۳ء کی کنونشن میں "قیامتِ موجود" کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ سولہ سال پہلے کی کہی گئی باتیں آج بھی کس طرح تر و تازہ ہیں۔ تر و تازہ ہی نہیں، بلکہ (غالب کے الفاظ میں) مئے کہن کی طرح یہ اور بھی گراں بہا ہو گئی ہیں۔ جو حقائق بھی قرآنِ کریم پر مبنی ہوں گے، مرورِ زمانہ سے ان کے حسنِ معنی میں اور جلا پیدا ہوتی جائے گی۔

اب وہ خطاب ملاحظہ فرمائیے:۔

(۰)

خطاب

بادہ کشانِ خمکدۂ قرآں کے نام

ساقی! قدحے کہ دورِ گلزار گذشت — مطرب! غزلے کہ وقتِ گفتار گذشت
اے ہم نفس! از بہرِ دلِ زار بگو — افسانۂ آں شبے کہ با یار گذشت

یارانِ میکدہ! سلام و رحمت۔

یہ ساعت کس قدر سعید، اور یہ لمحۂ زندگی کیسا درخورِ ہزار تبریک ہے کہ آپ احباب، ایک سال کی طویل مدت کے بعد اپنے ولولۂ شوق کو دلوں میں لئے، پھر یکجا جمع ہوتے ہیں کہ کچھ وقت کے لئے کشاکشِ روزگار سے الگ ہٹ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ خدائے لم یزل کی وہ شمعِ جہاں تاب، جسے صدیوں سے پیرانِ حرم کی مقدس آستینوں نے چراغِ تہِ داماں بنا رکھا ہے، کس طرح پھر سے وجہ نورانیتِ عالم بنے۔ کس قدر حسین ہیں یہ آرزوئیں، جو آپ کو اتنے دور دراز سفر کے بعد، کشاں کشاں یہاں لے آئی ہیں اور کیسا عظیم ہے وہ مقصد جس کے لئے آپ نے یہ صعوبات برداشت کی ہیں۔ میں، جب آپ احباب کے اس جذب و کیف میں ڈوبے ہوئے اجتماعِ سادہ و رنگین پر نظر ڈالتا ہوں تو میری نگاہِ شوق بے تابانہ پکار اٹھتی ہے کہ:

نور ہی نور ہیں در و دیوار! — کون سا چاند گھر میں اترا ہے!

برادرانِ عزیز! یہ جو ہم نے وقت کے کارواں سے فرصت کے چند لمحات چھین لئے ہیں، تو آؤ ان میں تا

رسمِ مہر و وفا کی بات کریں — پھر کسی دل رُبا کی بات کریں
سخت بیگانۂ حیات ہے دل — آؤ۔ اس آشنا کی بات کریں
گیسوؤں کے فسانے دہرائیں — اپنے بختِ رسا کی بات کریں

کس قدر قابلِ صد رشک ہیں زندگی کے وہ لمحات جو "رسمِ مہر و وفا" کی باتوں میں گذریں۔

عزیزانِ من! علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ازلی کش مکش

سوال یہ ہے کہ چراغِ مصطفویؐ کیا ہے جس کے ساتھ، ازل سے تا امروز، شرارِ بولہبی ستیزہ کار چلا آ رہا ہے۔ یہ کونسی کش مکش ہے جس کا سلسلہ دراز، نوعِ انسان کی پوری تاریخ کو محیط

ہے۔ اس تماشہ گاہ میں ہزاروں قومیں آئیں اور چلی گئیں۔ سینکڑوں نظام اُبھرے اور بیٹھ گئے۔ متعدد تہذیبوں کے چراغ جلے اور بجھ گئے۔ لیکن وہ کونسے ایسے حریفانِ ازلی ہیں جن کی باہمی آویزش پر ان تمام تغیرات کا کوئی اثر نہ ہوا، اور ان کی ستیزہ کاری کا سلسلہ، ہر دور اور ہر مقام میں بدستور جاری رہا۔ اور اب تک جاری ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر جس قدر بھی غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے، کہ وہ کشمکش پیہم۔ وہ ستیزِ مسلسل۔ وہ آویزشِ متواتر۔

دین اور مذہب کی جنگ

ہے جس دن سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی، اس جنگ کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت۔ سرمایہ پرستی وغیرہ بھی انسانیت کے کم دشمن نہیں، لیکن اگر آپ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ، اور اسی قسم کے دیگر مستبدانہ تصورات اور نظام، مذہب ہی کے سہارے قائم رہے ہیں اور جب دین نے مذہب کو مٹایا تو پھر اس کے ساتھ یہ خود بخود مٹ گئے۔ اس لئے اصل کشمکش دین اور مذہب ہی کی ہے۔

مذہب کی چیرہ دستیاں

مذہب کا تصور، مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوسرے انسانوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کریں اور یہ کچھ اس انداز سے کریں کہ یہ انہیں لوٹیں اور وہ انہیں دعائیں دیں۔ یہ انہیں دھتکاریں اور وہ ان کے پاؤں پڑیں۔ یہ انہیں بلاجرم وقصور گالیاں دیں اور وہ گڑگڑا کر معافیاں مانگیں۔ یہ بھری محفل میں انہیں بے عزت کریں لیکن وہ اپنے کمرے کی تنہائیوں میں، اپنے دل کے اندر بھی ان کی شان میں گستاخی کا خیال تک نہ لاسکیں۔ یہ ان سے ہر قسم کی خدمت اور بیگار لینا اپنا حق سمجھیں اور وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل، اپنی زندگی کا مقدس ترین فریضہ قرار دیں۔ ان کے ادنیٰ سے اشارے پر اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیں۔ اپنے بچوں کے گلے پر چھری پھیر دیں۔ آگ میں کود پڑیں۔ پہاڑ کی چوٹی سے سر کے بل نیچے آگریں۔ تختہ دار پر ہنسی خوشی چڑھ جائیں۔ ان کی رتھوں کے آہنی پہیوں کے نیچے آکر کچلے جائیں۔ یہ اپنے جس حریف کے خلاف چاہیں، انہیں کھڑا کر دیں، اور وہ اتنا جانے اور پوچھے بغیر کہ ہمیں ان کے خلاف کیوں لڑایا جارہا ہے، ان کی جانیں لیتے اور اپنی جانیں دیتے جائیں۔ وہ خود بھوکے رہیں اور ان کے خادموں کو نعمتیں کھلائیں۔ اپنے بچوں کو فاقے سے رکھیں اور ان کے کتوں کو دودھ پلائیں۔ خود ننگے رہیں اور ان کے پتھروں کو حریر و اطلس کے لبادے پہنائیں۔ آپ خس و خاشاک کی جھونپڑیوں میں زندگی کے دن کاٹیں اور ان کی ہڈیوں کی راکھ پر سنگِ مرمر کی فلک بوس عمارات استوار کریں۔ زندگی میں تو ایک طرف، ان کی موت کے بعد بھی ان کے دل پر ان کا خوف اس طرح طاری رہے کہ وہ ان کے تصور سے ڈرتے، کانپتے، لرزتے، سہمے رہیں۔ غرضیکہ یہ ہر وقت اُن بے چاروں کے اعصاب پر چھلاوے کی طرح سوار اور ان کے ذہن پر بھوت بن کر چھائے رہیں اور وہ ان کے پنجہ کی آہنی گرفت سے کبھی نکلنے نہ پائیں۔

یہ ہیں اس مذہب کے چند گوشے جسے مفاد پرست انسانوں کی عقلِ فریب کار نے تراشا اور جسے کمزور اور ناتوانوں کا خون چوسنے کے لئے ایک مؤثر ترین حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا استبداد بھی کچھ کم استخوان شکن اور خون آشام واقع نہیں ہوا۔ لیکن انہیں اپنے غلبہ و تسلط کی زنجیریں مستحکم رکھنے کے لئے سینکڑوں قسم کی قوتیں فراہم اور ہزار قسم کے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں اور پھر بھی انہیں ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ کب شکار ان کے جال سے نکل جائے۔ لیکن مذہبی دسیسہ کاریوں کا تو یہ عالم ہے کہ اس میں ——— صید خود صیاد را گوید بگیر ——— اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرے تو یہ غلام آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اور اگر کسی وقت کوئی زنجیر اتفاقاً ٹوٹ جائے تو یہ اس کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو اپنی مژگانِ ارادت سے اٹھا کر چومیں اور بصد عقیدت اپنے گلے میں ڈال لیں۔

مذہب کی گرفت

مذہب نے اپنی تمام مہرہ بازیوں اور سحر انگیزیوں کے لئے صرف ایک بنیادی حربہ استعمال کیا اور وہ یہ کہ اس نے جو کچھ چاہا اسے "خدا" کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کی ساری گرفت کا راز اسی میں ہے۔

لوگوں کو جاہل رکھا جائے

اس کے لئے، اس نے پیش بندی یہ کی کہ لوگوں کو سوچنے سمجھنے سے دُور رکھا جائے اور عقل و فکر کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ کوئی جتنی زیادہ جہالت آمیز باتیں کرے اسے اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جائے۔ جو جس قدر زیادہ بعید از علم و عقل امور پر یقین ظاہر کرے، اسے اتنا ہی زیادہ پختہ ایمان والا قرار دیا جائے۔ اربابِ مذہب کی ٹیکنیک ہی یہ ہوتی ہے کہ اپنے معتقدین کو جہالت کے گڑھے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ توہم پرستیوں پر ایمان کا مدار، اور تجربہ پسندیوں کو صداقت کا شعار قرار دیا جائے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان لایا جائے تو بلا علم و دلیل، اور ان کے احکام کی تعمیل کی جائے تو یہ پوچھے بغیر کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے۔ مذہب کی طرف سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کے حق میں اس کے پاس ایک ہی دلیل اور ایک ہی سند ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسا پچھلے سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہی مسلک تھا۔ اگر کوئی شخص مذہب کے پیش کردہ کسی عقیدے یا مسلک پر اعتراض کرے تو عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جائے کہ یہ شخص تمہارے اسلاف کی توہین کرتا ہے ——— اور عوام کے جذبات کو بھڑکا کر جس قدر فتنہ و فساد برپا کیا جا سکتا ہے، مذہب کی تاریخ خونچکاں کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے مقدس نام پر ہوئی ہیں، ہلاکو اور چنگیز کے حصہ میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ یہی وہ حربہ ہے جس سے اربابِ مذہب اپنے مخالفین کو اس طرح ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مذہب کا سارا مدار عوام کے جذبات پر ہے۔ اس

کے لئے وہ اس قسم کے مواقع پیدا، اور ایسی تقریبات وضع کرتے رہتے ہیں جن سے عوام کے جذبات میں شدت آتی رہے، اور ان کی یہ آگ بجھنے نہ پائے۔

یہ ہے اس مذہب کا اجمالی سا تعارف، جو پہلے دن سے آج تک انسانیت کی گردن میں پھانسی کا پھندا بن کر پڑا ہے۔ اور جس نے نوعِ انسان کی نس نس کو اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف، ذرا سی حرکت بھی نہیں کر سکتی۔

اور یہی ہے اس کی وہ آہنی گرفت جس سے نوعِ انسان کو چھڑانے کے لئے، خدا کی طرف سے

خدا کا دین

دین آتا رہا۔ اس دینِ خداوندی کے پیامبر، حضرات انبیاء کرامؑ تھے جو مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتے تھے۔ وہ انسانوں کو اس جنگل سے آزاد ہونے کی دعوت دیتے تھے اور اربابِ مذہب اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کر کے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس محاذ میں اربابِ اقتدار، ان کے پشت پناہ اور سرمایہ دار طبقہ ان کا حامی ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خدا کا دین، ان کے حق میں بھی تو موت کا پیغام تھا۔ وہ دین کو مغلوب اور مذہب کو غالب رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے، کیونکہ مذہب کے غلبہ میں خود اُن کی ہستی کا راز مضمر تھا۔

دین اور مذہب کی یہی وہ کش مکش ہے جو پہلے دن سے آج تک دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے میں مسلسل اور پیہم چلی آرہی ہے، اور اسی کو علامہ اقبالؒ "چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسے انسانیت کے لئے بدترین لعنت اور خدا کا عذاب قرار دیتے ہیں۔ وہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں:-

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر ۔۔۔ سود خوار و والی و مُلّا و پیر

یعنی مذہب کا شجرۃ الزقوم اور اس کی پروردہ شاخیں۔ ملوکیت اور سرمایہ داری۔

ہمارے زمانے میں سرمایہ داری کے خلاف جذبات شدت سے اُبھر رہے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کی نگاہ اس طرف اٹھتی ہے کہ سب سے زیادہ شدید "سرمایہ دار" طبقہ تو مذہبی پیشوائیت کا ہے۔ سرمایہ دار کا یہی جرم ہے کہ وہ خود محنت نہیں کرتا اور دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ لیکن اسے اس کے لئے کچھ سرمایہ لگانا (I N V E S T کرنا) پڑتا ہے۔ اس کے برعکس مذہبی پیشوائیت ہے کہ ایک پیسہ (I N V E S T) کئے بغیر دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرتا ہے۔ کہئے! اس قسم کی سرمایہ داری کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟

دین اور مذہب کی کش مکش

قرآن کریم، دین اور مذہب کی اس کش مکش کے متنوع گوشوں کو بار بار سامنے لا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ اس کش مکش کی ابتدا حضرت نوحؑ کی اس انقلابی دعوت سے کرتا ہے جس کی رو سے انہوں نے، مذہب کی غیر خدائی قوتوں کی محکومیت میں جکڑی ہوئی قوم سے کہا کہ: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۵۹)۔ اے میری قوم کے لوگو! تم، مذہب کے ان اجارہ داروں کی اطاعت

اور محکومیت کی زنجیروں کو توڑ دو۔ اور صرف ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کرو۔ یاد رکھو! اُس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اس آزادی کی آواز کے خلاف، ارباب مذہب اور ان کے پشت پناہ اہلِ اقتدار ——— یعنی مترفین طبقہ کے لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے تھے، یورش کر کے آگے بڑھے۔ انہوں نے عوام کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ (۲۳/۲۴) جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ تمہارے اباواجداد کے مسلک کے خلاف ہے۔ یہ تمہیں تمہارے بزرگوں کی روش سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ (۲۳/۲۵) یہ پاگل ہے اس کی کوئی بات نہ سنو۔

اس کے بعد قرآن کریم نے سلسلۂ انبیاءِ کرامؑ کی ایک ایک کڑی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی دعوت یہی تھی کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گزار بنائے۔ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کی جاسکتی ہے جنہیں وہ (بذریعہ وحی) اپنی کتاب میں دیتا ہے۔ وہ یہ دعوت دیتے رہے اور ان کے خلاف، ہر زمانے میں، اور ہر مقام پر مذہبی پیشوائیت اور اربابِ ثروت و اقتدار متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہوتے رہے۔ ان کے پاس عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے ایک ہی سلوگن تھا اور وہ یہ کہ مَا هٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ ..... (۳۴/۴۳) یہ شخص چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب سے برگشتہ کر دے۔ اس لئے اٹھو۔ اسے پکڑو۔ حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ (۲۱/۶۸) اسے زندہ جلا دو اور اس طرح اپنے خداؤں کا بول بالا کرو۔

حضرت عیسیٰؑ کی انقلابی آواز

اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسےٰؑ کے زمانے میں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ بنی اسرائیل کے احبار و رہبان نے ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی جس میں انہیں ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے۔ صرف سزائے موت کے لئے انہیں رومی حکام کی منظوری لینی پڑتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت، مظلوم اور مقہور انسانیت کو ان کے اس پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے تھی۔ یروشلم کا ہیکل، ان مذہبی پیشواؤں کا مرکز تھا۔ داعیٔ انقلابِ آسمانی، حضرت عیسےٰؑ اسی ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور انہیں للکار کر کہتے کہ:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ ہی داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے خشکی اور تری کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا ایندھن بنا دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔

(انجیل متی - باب ۲۳)

ظاہر ہے کہ مذہبی اجارہ دار، جو اپنی خدائی سندیں بچھا کر، عوام کو لوٹتے اور ان پر حکومت کرتے تھے، اس انقلابی دعوت کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے؟ وہ اسے، اپنی مفاد پرستیوں کے لئے کس طرح موت کا پیغام سمجھتے تھے، اس کا اندازہ ان کی اس چیخ اور پکار سے لگ سکتا ہے جسے انجیل برنباس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:-

مخالفت کیوں؟

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے..... اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ حالانکہ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، جیسے ہم ان کی شریعت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ ہم جو چاہیں کریں۔ اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے اور قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز راضی نہ کیا جا سکے گا۔ جب تک خدا کی عبادت (اطاعت) ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔

(انجیل برنباس - صـ۱۴۲)

آپ نے غور فرمایا کہ اس آسمانی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ —— بس وہی ایک وجہ! یعنی اگر خدا کا قانون رائج ہو گیا تو ہم اپنی ان سندوں سے الگ کر دیئے جائیں گے۔ اور چونکہ ہمیں کوئی کام کاج آتا نہیں جس سے ہم اپنی روٹی کما سکیں، اس لئے ہمیں اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگنی پڑے گی۔

آپ نے دیکھا کہ جسے مذہبی معاملہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت یکسر معاشی مسئلہ ہوتا ہے۔

انجیل برنباس کے اس بیان سے آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ اس انداز حکومت کو پسند کرتی ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں سیکولر کہتے ہیں۔ یعنی امورِ مملکت، حکومت کے پاس رہیں اور امور شریعت مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ نہ مذہبی پیشوائیت، حکومت کے معاملات میں دخل دے اور نہ ہی حکومت ان کے حیطۂ اقتدار میں دخیل ہو۔

نبی اکرمؐ کی دعوت

آخر میں اس عظیم و جلیل داعیٔ انقلاب کو دیکھئے جس پر سلسلۂ نبوت کا خاتمہ ہو گیا (صلی اللہ علیہ وسلم) حضورؐ کے ظہورِ قدسی کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) وہ نوعِ انسان کو ان زنجیروں سے آزاد کر دے گا جن میں وہ جکڑے چلی آ رہی ہے اور ان کے سر سے وہ بوجھ اتار دے گا جس کے نیچے وہ بُری طرح دبی اور کچلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حضورؐ نے بھی وہی دعوت پیش کی جو حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسےٰؑ تک مسلسل و متواتر پیش ہوتی چلی آ رہی تھی اور مترفین کے طبقہ کی طرف سے اس کا جواب بھی وہی ملا جو شروع سے ملتا چلا آ رہا تھا۔ یعنی مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ۔ جو بات یہ شخص کہتا ہے اسے ہم نے اسلاف کے مذہب میں کہیں نہیں سنا۔ لہٰذا: إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷) یہ غلط، جھوٹ اور بنائی ہوئی بات ہے۔ یعنی اس کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی ـــــ اس کے بعد اس طبقہ کی طرف سے جو کچھ نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاء کے ساتھ ہوا، اس پر قرآن شاہد اور تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔

نبی کے بعد کیا ہوتا تھا

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حضرات انبیاء کرامؑ خدا کا سچا دین انسانوں کو دے جاتے تھے تو اس کے بعد اس دین کے ساتھ کیا بیتتی تھی کہ بعد میں آنے والے نبی کے وقت، سابقہ نبی کے پیش کردہ دین کی آواز کہیں سے بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس (لئے) نبی کی اوّلیں مخاطب (بالعموم) وہی قوم ہوتی تھی جو اپنے آپ کو سابقہ نبی کی متبع کہتی تھی۔ پھر یہ کیا تھا کہ آنے والا نبی اس قوم کے مسلک کو باطل قرار دیتا تھا اور یہ قوم، اس نبی کی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کرتی تھی۔

ہونا یہ تھا کہ جب ایک نبی دینِ خداوندی دے کر چلا جاتا تو اس کے بعد، اس قوم میں ایسے مفاد پرست لوگ پیدا ہو جاتے جو اس دین کو اپنے خیالات کی آمیزش سے، مذہب میں تبدیل کر دیتے، لیکن لوگوں سے کبھی یہ نہ کہتے کہ یہ ہمارے خیالات ہیں۔ وہ اس مذہب کو خدا کی سچی تعلیم کہہ کر پیش کرتے ـــــ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ وہ خود شریعت وضع کرتے اور کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ ایسا کیوں کرتے؟ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (۲/۷۹) ـــــ تاکہ اس سے کچھ پیسے کما لئے جائیں۔ چنانچہ اس طرح خدا کا دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب دین، اس طرح مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کچھ جزوی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں بلکہ مذہب، دین کی پست سطح کا نام ہو۔ یہ دونوں بالکل ایک دوسرے کی ضد بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے مدِمقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے مذہب اور دین کا تقابلی مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ:-

مذہب اور دین کا تقابل

1	مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2	مذہب میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بنا سکتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3	مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4	مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح
5	پیدا کر رہے ہیں یا نہیں؟	راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
	مذہب علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔	دین، انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب۔
6	مذہب، عقل کے دیئے گل کرتا ہے کہ اُس کا چراغ جلے۔	دین عقل کے دیئے میں روغن ڈالتا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگائیں۔
7	مذہب اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنا پر منواتا ہے۔	دین اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
8	مذہب، لوگوں کو روشنی سے، تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ (۲/۲۵۷)۔	دین، انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (۲/۲۵۷)۔
9	مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کئے پامال راستوں پر چلتے جاؤ۔	دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ ؎ تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن حرام است
10	مذہب، عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے مذہب، ہر زمانے میں نئے نئے بت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی سطح بلند کرتا ہے۔ دین تیشۂ ابراہیمی سے ہر قدیم اور جدید بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔
11	مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ: ؎ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین کا پیغام یہ ہے کہ: ؎ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
12	مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا	دین، خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے

	مذہب	دین
	کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دل کو جرأت اور بیباکی کا مسکن بناتا ہے۔
13	مذہب انسان کو ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونا سکھاتا ہے۔	13 دین اُسے ایک خدا کے قوانین کا اطاعت گزار بنا کر دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔
14	مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔ مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ: بدریا در منافع بے شمار است وگر خواہی سلامت برکنار است	۱۴ دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ دین کی پکار یہ ہے کہ: بدریا غلط و باموجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
15	مذہب، مادی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دے کر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔	15 دین مادہ کی تسخیر سے، انسان کو حدود فراموش بلندیوں تک لے جاتا ہے۔
16	مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخرت کی جنّت کا وعدہ دیتا ہے۔	16 اور دین، اس دنیا کو سنوارنے سے یہاں بھی جنّت حاصل کرتا ہے اور وہاں بھی۔
17	مذہب، تقدیر کے بہانے انسان کو یکسر بے عمل بنا دیتا ہے۔	17 دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے...
18	مذہب، کمزوروں - ناتوانوں - مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ اس سے مستبد، ظالم اور غاصب قوتیں بے لگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔	18 دین ظلم و استبداد - سلب و نہب کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور مستبد حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔
19	مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔	۱۹ دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔
20	مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دیکھتا ہے اور انسان میں ایسی مایوسانہ ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس میں اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ: آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں	۲۰ دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان کی نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ نامساعد حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھتا ہے اور بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ: شبِ گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے

21	مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے۔	دین اعلان کرتا ہے کہ: مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (۷/۳۲) وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔
22	مذہب، موت کی سسکیاں ہیں۔	دین، زندگی کے قہقہے۔
23	مذہب ایک خواب پریشاں ہے۔	دین، زندہ حقیقت۔
24	مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دیتا ہے۔	دین کہتا ہے کہ: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ - زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔
25	مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔	دین قبرستانوں میں صورِ اسرافیل پھونک کر مردوں کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔
26	مذہب انسانیت کی موت ہے۔	دین ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
27	دینؒ دمِ جبرئیل - دین دلِ مصطفےٰ	دین خدا کا رسول - دین خدا کا کلام ! ! !
28	دین فقیہہ حرم - دین امیرِ جنود	دین ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
29	دین کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات	دین سے نورِ حیات - دین سے نارِ حیات

یہ ہوتا ہے دین جو مذہب میں تبدیل ہو کر انسانیت کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لئے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سچ کے نقاب میں پیش کرتا ہے۔ مذہب بھی یہی کرتا ہے۔ وہ دین کے الفاظ، اصطلاحات، رسوم و مناسک اسی شکل میں قائم رکھتا ہے لیکن ان کی روح نکال دیتا ہے۔ یہی دین کے وہ بے روح خدوخال ہیں جن سے مذہب عوام کو دھوکا دیتا ہے — مذہب، درحقیقت دین کی ممی شدہ لاش کا نام ہے۔

——(٥)——

اسلام کے ساتھ یہی کچھ ہوا

دین کے ساتھ جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ہاتھوں ہوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ اللہ تعالےٰ نے اس دین کو قرآنِ کریم میں مکمل کیا۔ اور حضورؐ نے اس قرآن کو اُمت کو دے دیا۔ لیکن حضورؐ کی تشریف بری کے تھوڑا عرصہ بعد، مفاد پرست قوتوں نے ابھرنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ، پہلے ملوکیت آئی۔ اس کے ساتھ سرمایہ داری اور ان دونوں نے اپنے تحفظ کے لئے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ

ؒ اصل اشعار میں "دین" کے بجائے "عشق" کا لفظ ہے۔

اسی طرح مذہب میں تبدیل ہو گیا جس طرح سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کا لایا ہوا دین تبدیل ہوا تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس دین کا ضابطہ ـــــ قرآن کریم ـــــ اپنی اصل شکل میں محفوظ رہا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔ لیکن اس کتاب کا محفوظ رہنا، مذہب کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔ چنانچہ اس نے اسے قوم کی زندگی سے عملاً خارج کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ رسول اللہ ؐ کے بعد، کسی نبی نے نہیں آنا تھا جو دین کو اس کی اصل شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ کسی آنے والے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دین، قرآن کریم کے اندر منضبط تھا اور قرآن حرفاً حرفاً محفوظ۔ اس لئے اب دین کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنے کی صورت یہی تھی کہ قرآن کریم کو عملی زندگی کا ضابطہ بنانے کی کوشش کی جائے۔

تحریکِ پاکستان

یہی وہ کوشش تھی جو ہمارے زمانے میں تحریک پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔ جیسا کہ معلوم ہے، پاکستان کا تصوّر علامہ اقبال ؒ کی بصیرت قرآنی کا رہین منت ہے۔ انہوں نے اس مطالبہ کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی تھی کہ قرآن کریم مسلمانوں کی عملی زندگی کا ضابطہ اسی صورت میں بن سکتا ہے جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اصول و احکام نافذ کئے جا سکیں۔ غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا۔ آپ احباب کو معلوم ہے کہ تحریک پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے علماء حضرات کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز، باہمدگر ستیزہ کار چلی رہی ہے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفت

مذہب کی اوّلین کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت کا پورا اقتدار بالواسطہ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہے اور حکمران طبقہ ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشینری کا کام دے۔ اس انداز کو تھیا کریسی کہتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مذہبی پیشوائیت یہ چاہتی ہے کہ مملکت میں ایسا نظام قائم ہو جس میں امورِ سیاست، حکومت کی تفویض میں رہیں اور امورِ مذہب، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔ ہمارے قرنِ اوّل کے بعد، جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس میں ایسے ادوار بھی آتے رہے جن میں تھیاکریسی کا دور دورہ تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی حکومتوں کا انداز سیکولر رہا۔ اسی انداز کو انگریزوں نے ہندوستان میں قائم رکھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں بھی پبلک لاز، حکومت کی تحویل میں تھے، اور پرسنل لاز ارباب مذہب کے سپرد۔ تحریک پاکستان سے مقصود یہ تھا کہ اس مملکت میں نہ تھیاکریسی باز پا سکے نہ سیکولرازم۔ اس میں دین کی حکمرانی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں (ملوکیت اور سرمایہ داری کی طرح) مذہبی پیشوائیت کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ دوسری طرف ہندو نے یقین دلایا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد مملکت کا نظام بدستور سیکولر رہے گا۔ چونکہ یہ انداز، مذہبی پیشوائیت کو (SUIT) کرتا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہندوؤں سے مفاہمت کر لی۔ مذہب اپنے مفاد کے تحفّظ کے لئے ہر ایک سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ لیکن دین لاشریک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کسی سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے　　عشق بیچارہ نہ صوفی ہے نہ مُلّا نہ حکیم

اس لئے تحریک پاکستان جو دین کی بنیادوں پر اٹھی تھی، نہ ہندو سے مفاہمت کر سکتی تھی نہ مذہبی پیشوائیت سے۔ چنانچہ جب اس تحریک نے مذہبی پیشوائیت سے مفاہمت نہ کی تو اس نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انہیں نیشنلسٹ یا (قوم پرست) علماء کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ وہاں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو مذہب کے نام پر مملکت کا پورا اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ یعنی یہ طبقہ تھیاکریسی قائم کرنے کا متمنی تھا۔ چونکہ دین کی نظروں میں تھیاکریسی بھی ایسی ہی باطل ہے جیسی سیکولرازم، اس لئے تحریک پاکستان اس طبقہ سے بھی مفاہمت نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا یہ طبقہ بھی تحریک پاکستان کا مخالف تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ تحریک پاکستان کی کش مکش، کس طرح درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے تا امروز ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔ اور وہی کش مکش یہاں بھی جاری ہے۔

چونکہ مذہب، ہر نظریہ، ہر تصور، ہر نظام اور ہر ادارہ کے ساتھ مفاہمت کر سکتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ اس کا پشت پناہ ہوتا ہے، اس لئے ان لوگوں کے پاس نہ روپے پیسے کی کمی ہوتی ہے نہ اسباب و ذرائع کی محتاجی۔ روپے کے زور پر یہ لوگ پراپیگنڈہ کی مشینری پر قابو پا لیتے ہیں اور جھوٹ کو سچ کر کے دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ دین، ان قوتوں میں سے کسی کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے جو لوگ اس کی دعوت کو لے کر اٹھتے ہیں ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔

سامان و ذرائع کی فراوانی

فقر جنگاہ میں بے سازو یراق آتا ہے

در مختلف حربے

پھر، مذہب اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر حربے کا استعمال جائز سمجھتا ہے۔ وہ جھوٹ بولنے میں بھی کوئی باک نہیں محسوس کرتا۔ سینٹ پال کے الفاظ میں بڑے فخر سے کہتا ہے کہ

> اگر میرے جھوٹ کے سبب، خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔　(رومیوں کے نام - ۳/۷)

وہ تعلیم یہ دیتا ہے کہ دنیا کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے بڑے مقدس اور زریں اصول پیش کرو۔ لیکن جب اس طرح قوت حاصل ہو جائے تو پھر ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر عملاً وہی کچھ کرو جس میں اپنا مفاد مضمر ہو۔

مذہب ہمیشہ سے یہی کچھ کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی فریب کاریوں سے دین کو شکست دے سکتا ہے۔ دین، خدا کے اٹل قوانین کا نام ہے۔ اور ان قوانین کا آخرالامر غالب آنا خدائی پروگرام ہے۔ خدا کے پروگرام کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن حق آہستہ آہستہ باطل کے نظام پر غالب آتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس لئے کہ خدا کا

دین کا غلبہ

ایک ایک دن ہزار ہزار سال، بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ جن ارباب نظر کی نگاہیں ان انقلابات پر ہیں جو اس وقت دنیا کے مختلف گوشوں میں رونما ہو رہے ہیں۔ (اور جنہیں علامہ اقبالؒ نے "قیامت موجود" سے تعبیر کیا ہے) انہیں نظر آ رہا ہے کہ اب مشیت کے پروگرام کے مطابق باطل کے نظامہائے زندگی کے مٹنے کا وقت بڑی تیزی سے آ رہا ہے۔ دنیا سے ملوکیت کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے۔ ہر نئے سورج کے ساتھ کوئی نہ کوئی تاج فضا میں اڑتا دکھائی دیتا ہے۔ نظام سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری، حرف غلط کی طرح مٹ رہا ہے۔ اور ان کے ساتھ ہی مذہب کی سحر کاریاں بھی ابخرات کی طرح ہوا میں اڑتی چلی جا رہی ہیں۔ آپ تھوڑا سا غور کریں گے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ انسانی قلوب و اذہان پر مذہب کی جو گرفت آج سے پچاس سال پہلے تھی، وہ بڑی حد تک ڈھیل پڑ چکی ہے۔ ہندوستان

مذہب کا انجام

سے سناتن دھرم بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ بدھ مت کا مامن و مسکن چین تھا۔ اسے وہاں سے دیس نکالا مل چکا ہے۔ تبت ان کے خداؤں (للاماؤں) کا پایۂ تخت تھا۔ وہ وہاں سے بیک بینی و دو گوش نکالے جا چکے ہیں اور اب اپنی جان کی حفاظت کے لئے در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہودیت 'مذہب' کو چھوڑ کر، سیاست میں بدل چکی ہے۔ عیسائیت کی قدیم عمارت کا وسطی ستون، پوپ ہے۔ اس ستون کی بنیادوں میں بھی لرزش پیدا ہو رہی ہے۔ غرضیکہ مذہب کی دنیا میں آپ جہاں بھی دیکھیں گے آپ کو نظر آ جائے گا کہ ؎

مے خانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل ۔۔۔ بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

علامہ اقبالؒ نے عرصہ ہوا، لیگ آف نیشنز (آنجہانی) کے متعلق کہا تھا کہ: ؎

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ۔۔۔ ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن ۔۔۔ پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ ۔۔۔ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

جو کچھ انہوں نے لیگ آف نیشنز کے متعلق کہا تھا، وہی کچھ اب انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے متعلق نظر آتا ہے۔ اس وقت ارباب مذہب کے ہاں جذبات کی جو شدت نظر آتی ہے وہ ان کی حرکتِ مذبوحی ہے۔ اس سے یہ کچھ وقت کے لئے فضا میں انتشار اور معاشرہ میں خلفشار تو پیدا کر سکتے ہیں، اپنی مسندوں کو گرنے سے بچا نہیں سکتے۔ زمانے کے تقاضے انہیں ختم کر کے رہیں گے۔

لَا و اِلَّا

اس مقام پر ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ جب باطل، زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں مٹتا ہے تو اس طریق کار میں ایک نقص رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ تقاضے صرف باطل کو مٹاتے ہیں، اس کی جگہ، حق کا نظام ساتھ کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے درمیان ایک خلا رہ جاتا ہے جسے قانونِ خداوندی کی کائناتی رفتار کے مطابق پُر کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں زمانے کے تقاضے "فصد کے نشتر" ہوتے ہیں جو فصد کھول کر کثیف خون باہر نکال دیتے ہیں۔ لیکن اس کی جگہ صالح خون ساتھ کے ساتھ پیدا نہیں کرتے۔ یہ کام ان لوگوں کے

کرنے کا ہوتا ہے جو دین کا نظام قائم کرنے کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہ وقت، جب زمانے کے تقاضے باطل کے کسی نظام کو مٹا رہے ہوں، ان لوگوں کے لئے بڑا سازگار بھی ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا صعوبت انگیز اور صبر آزما بھی۔ سازگار تو اس لئے کہ ان کا آدھا کام ——— یعنی لا الٰہ کا مرحلہ ——— زمانے کے تقاضے یا اللہ کے نشتر پورا کر دیتے ہیں۔ انہیں اس ہموار شدہ زمین پر الا اللہ کی عمارت استوار کرنی ہوتی ہے۔ لیکن پُر از صعوبات اور صبر آزما اس لئے کہ جس طرح ایک "بھوت" نکلتے وقت بڑی دہشت انگیز نشانی پیچھے چھوڑتا ہے، باطل کی قوتیں نزع کی حالت میں بڑی سخت لکد کوبی کرتی ہیں۔

فطرت کا یہ طریق کار (PROCESS) بڑا دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ وہ مذہب پرست طبقہ کو اس خود فریبی میں مبتلا کر دیتی ہے کہ اگر قوت ان کے ہاتھ میں آجائے تو ان کی جڑیں مضبوط ہو جائیں گی۔ چنانچہ یہ لوگ حصولِ اقتدار کے لئے بڑی تگ و تاز کرتے ہیں اور اکثر اوقات اسے حاصل بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن یہی چیز ان کی موت کے فرشتے کی رفتار کو تیز تر کر دیتی ہے۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

اقوامِ عالم کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جب کبھی اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آیا تو ان سے اس قسم کے اذیت ناک اور کرب انگیز مظالم ظہور میں آئے جن کی مثال کسی ہلاکو اور چنگیز کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ (واضح رہے کہ شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہے کہ زمامِ حکومت براہِ راست ان کے ہاتھ میں آئی ہو۔ بالعموم ان کے اقتدار کی شکل یہی ہوتی ہے کہ کوئی حکمران ان کا ہم عقیدہ ہو اور اس طرح بالواسطہ اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے) سیاسی حکمران طبقہ اپنے مخالفین کا، جن سے اسے کسی خطرہ کا اندیشہ ہو، استیصال چاہتا یا کرتا ہے، لیکن مذہبی پیشوائیت کا اپنے مخالفین کے خلاف انتقام جوئی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے سوا، سب کو خدا کے باغی، ملحد، بے دین، فاسق، فاجر سمجھتے ہیں۔ اور اپنے متعلق اس زعمِ باطل میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم خدا کے منتخب بندے ہیں، جنہیں اس نے ان گمراہ لوگوں کو سیدھا کرنے کے لئے مامور کر رکھا ہے۔ اس بنا پر ان فاسقوں اور فاجروں کے خلاف ان کے دل میں بغض اور نفرت کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ نفسیات کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ بغض اور نفرت سے انسان (SADISM) کا شکار ہو جاتا ہے۔ (SADISM) کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کا مریض دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوش ہوتا اور لذت لیتا ہے۔ جب اقتدار ان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا تو یہ ان لوگوں کو، جو ان کے ہم عقیدہ نہیں ہوتے، عذابِ خداوندی کی وعید سناتے رہتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ یہ حضرات اپنے وعظوں اور خطبوں میں اس عذاب کی تفاصیل بڑی لذت لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اس سے ان کے (SADISM) کے جذبہ کی ذہنی تسکین ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ، ان کی انتقام جوئی کے سلسلے میں ایک اور جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی

بڑے سے بڑے مستبد اور ظالم صاحبِ اقتدار کے ضمیر میں کبھی خلش پیدا ہوا اور وہ اپنے کئے پر نادم ہو جاتے۔ لیکن ان حضرات کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے مخالفین کے خلاف جو کچھ کرتے ہیں وہ جہاد ہے اور بارگاہِ خداوندی میں تقرب کا موجب۔ اس لئے یہ اپنے مخالفین پر جس قدر بھی مظالم کرتے ہیں خوش ہوتے ہیں کہ اس سے انہیں ثوابِ عظیم حاصل ہوتا ہے۔

آپ ان حضرات کی اس نفسیات پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ جب ——— خدا نہ کردہ ——— اقتدار ان کے ہاتھ میں آ جائے تو انسانیت کس عذاب میں مبتلا ہو جائے گی۔ اقوامِ عالم کی تاریخ ان کی خونریزیوں، سفاکیوں، کرب انگیزیوں اور اذیت رسانیوں کی لرزہ انگیز داستانوں سے خونچکاں ہے۔ ان کی تفصیل میں جانے کے لئے مجلدات درکار ہوں گی۔ یہاں چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عیسےٰ ؑ کس طرح ہیکل کے مذہبی پیشواؤں کی عفونت آمیز سیاہ کاریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے تھے۔ بالواسطہ اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے ان پر ہاتھ ڈالا اور (بزعمِ خویش) اس قسم کی موت مارا جو انتہائی اذیت رساں بھی تھی اور ان کے عقیدہ کی رُو سے لعنتی بھی۔ اذیت رسانی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے ان کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھوک کر صلیب پر لٹکا دیا کہ وہ کرب و اذیت، بھوک، پیاس اور دھوپ کے عذاب سے سسک سسک کر جان دیں۔ اس سے ان کی ہوسِ انتقام جوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہودیوں سے آگے بڑھ کر عیسائیوں کی طرف آئیے اور ان کے (REFORMATION) کے زمانے کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیئے۔ اس میں آپ کو ظلم اور استبداد کی ایسی ایسی لرزہ انگیز داستانیں ملیں گی، جن سے آپ کی روح کپکپا اٹھے۔ صرف ایک شہر پیرس میں چھ مہینے کے عرصے میں ایک عینی شاہد کے بیان کی رو سے ستائیس انسانوں کو زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ تین مہینے کے عرصے میں دس ہزار انسانوں کو جلایا گیا یا تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ ۱۵۸۱ء سے دو ایک سال پہلے کے عرصہ میں جن لوگوں کو مختلف اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا گیا یا زندہ جلایا گیا ان کی تعداد دو لاکھ سے کم نہیں[ط۱]۔ اذیتیں کس قسم کی ہوتی تھیں اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ہنری نامی ایک ممتاز پادری کو جس کے خلاف "کفر کا فتویٰ" لگا تھا۔ اس کے بستر سے اٹھایا گیا۔ پشت کی جانب اس کے ہاتھ باندھے گئے۔ اس کے سارے کپڑے اتار دیئے گئے اور اس کے پاؤں میں رسی باندھ کر اسے برف آلودہ سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے مقتل کی طرف لے گئے۔ وہ لہولہان ہو رہا تھا اور چیختا تھا کہ مجھے مارنا ہی ہے تو کم از کم مجھے مقتل تک اٹھا کر لے جاؤ لیکن اس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ اسے زندہ جلانا مقصود تھا لیکن لکڑیاں گیلی تھیں اس لئے ان میں آگ نہیں لگ رہی تھی۔ دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اُسے جھلستی ہوئی لکڑیوں میں پھینک دیا گیا کہ وہ سسک سسک کر کباب ہو جائے بالآخر اُسے لاٹھیوں سے پیٹ پیٹ کر ہلاک کیا گیا اور ان خدائی

ط۱ (THE CAMBRIDGE MODERN HISTORY, VOL: II, P. 347)

فوجداروں نے نعرہ بلند کیا کہ "خدائے مسیح کا بول بالا ہو"۔[1]

خود ہماری تاریخ بھی کچھ کم خونچکاں اور لرزہ انگیز نہیں۔ عباسیوں کے زمانے میں ایک مسئلہ خلقِ قرآن کو لیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس عقیدہ کے موافق اور مخالف گروہوں نے اپنی اپنی باری مخالفین کو کس کس قسم کے کرب انگیز مظالم کا نشانہ بنایا۔ جعد بن درہم کو خالد بن عبداللہ نے عید الاضحٰے کے دن قربانی کے طور پر اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور اس کے بعد اسی خالد کو اس کے مخالف، یوسف نے شکنجہ میں کس کر اس کے سینے کو ریتی سے ریت ڈالا۔ خلیفہ واثق نے احمد بن نصر کو سامرہ میں سولی پہ چڑھا دیا اور اس کے سر کو بغداد بھیج دیا۔ کان میں ایک رقعہ لٹکا دیا جس پہ لکھا تھا۔

> یہ احمد بن نصر مشرک اور گمراہ کا سر ہے جس کو امیر المؤمنین نے بغرضِ تقربِ الٰہی خود اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحؒ جیسی واجب الاحترام ہستی کو اٹھارہ ماہ تک ایک تنگ و تاریک قید خانہ میں سختیاں جھیلنے کے لئے محبوس رکھا۔ وہاں انہیں اس قدر شدت سے پیٹا جاتا تھا کہ ان کے جسم کے گوشت کے ٹکڑے اڑ اڑ جاتے تھے۔ یہ سب کس جرم کی پاداش میں تھا؟ اس جرم کی پاداش میں کہ وہ ان علمائے (جن کا ہم خیال خلیفہ تھا) ایک عقیدہ میں اختلاف رکھتے تھے۔ اور وہ عقیدہ بھی محض نظری اور فرعی تھا۔

ان شخصی اذیت رسانیوں کے علاوہ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ انہیں جن علماء سے بھی اختلاف ہوتا ان کی تصنیفات کے ایک ایک ورق کو تلاش کر کے تلف کر دیا جاتا۔ مثلاً ابومسلم اصفہانی نے تیرہ جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ ابوالقاسم بلخی نے بارہ جلدوں میں تفسیر مرتب کی۔ اسی طرح ابوبکر اصم اور قفال نے بھی بڑی بڑی ضخیم تفسیریں لکھیں۔ یہ لوگ بڑے ذی علم اور ذہین تھے۔ ان کی تفسیریں قرآنی علوم میں نہایت قیمتی اضافہ تھیں۔ مگر آج یہ سب ناپید ہیں۔ ان کے صرف بعض اقوال امام رازی وغیرہ کی تفسیروں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ خود امام رازی کو بھی دار و گیر کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے روپوش ہو کر اپنی جان بچائی۔ امام ابن حزم کو بھی جلاوطن ہونا پڑا اور وہ اسی حالت میں صحرائے لیلہ میں وفات پا گئے۔ علامہ آمدی کو بھی علماء سے بعض اختلافات کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ ابن رشد کو فلسفہ کے جرم میں پہلے نظر بند کیا گیا۔ پھر جلاوطن اور ان کی کتابیں جلا دی گئیں۔ محدّث ابنِ حبان کو اتنی سی بات پہ جلاوطن کر دیا گیا کہ انہوں نے کہا تھا کہ "خدا محدود نہیں ہے ہر جگہ موجود ہے"۔

میں نے یہ چند واقعات محض مثال کے طور پہ بیان کئے ہیں، ورنہ دیگر مذاہبِ عالم کی طرح، ہماری تاریخ بھی اسی قسم کے واقعات سے لالہ زار ہے۔ جس سے کسی مسئلہ میں ذرا سا اختلاف ہوا، اس کے خلاف کفر کا فتویٰ لگایا۔ اس سے وہ مرتد قرار پا گیا۔ یہ مسئلہ پہلے سے وضع کر دیا کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ اور اس فیصلہ کی رو سے "بحکم شریعت" اسے حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ جب حالات نے پلٹا کھایا اور کوئی ایسا

---

[1] HISTORY OF THE REFORMATION BY D'AUBIGNE, VOL. III P.135

حکمران برسرِ اقتدار آگیا جو ان لوگوں کا ہم عقیدہ تھا جن کے خلاف کفر کے فتوے لگے تھے تو پھر ان کی باری آگئی جنہوں نے ایسے فتوے لگائے تھے۔ پھر یہ مرتد قرار پاگئے اور ہلاک کر دیئے گئے۔ اس ہزار سال کے عرصہ میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔

اسے اس طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارے زمانے میں موجودہ فرقوں میں سے کوئی فرقہ ایسا نہیں جس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ اور چونکہ ہر مسلمان کسی نہ کسی فرقہ سے متعلق ہوتا ہے اس لئے کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں جو کافر نہ قرار پا چکا ہو۔ یہ تو غنیمت ہے کہ یہ فتوے اس زمانے میں لگے جب اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں نہ تھا۔ ورنہ اگر ان حضرات کے فتووں پر عمل درآمد کرنے والا حکمران طبقہ ہوتا تو ہندو پاکستان میں کوئی ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہتا۔ یہ تو رہے وہ مسلمان جو کسی نہ کسی فرقہ سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کو بھی نہ چھوڑا۔ ان کے خلاف بھی کفر کے فتوے صادر کر دیئے گئے۔ لیکن وہ بھی اس لئے زندہ بچ رہے کہ مرتد کی سزا قتل پر عمل درآمد کرنے والی حکومت موجود نہ تھی۔ نہ ہی اقتدار براہِ راست ان حضرات کے ہاتھ میں تھا۔ جب اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آتا ہے تو اس میں انسانیت پر کیا قیامت گذرتی ہے اس کی تازہ مثال انقلابِ ایران ہے۔ اس انقلاب میں زمامِ اقتدار وہاں کی مذہبی پیشوائیت کی سب سے بلند شخصیت امام الخمینی کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے زیرِ ہدایت ایک خفیہ اسلامی عدالت قائم ہے جس کے ناموں تک کا کسی کو علم نہیں۔ اس عدالت میں ان کے مخالفین کے خلاف مقدمات پیش ہوتے ہیں، چند گھنٹوں میں ان کی سماعت ہو جاتی ہے۔ سزائے موت کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے اور ان مخالفین کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ آج (۹ مئی ۱۹۷۹ء) تک اس طرح سزائے موت پانے والوں کی تعداد ۲۳۸ تک پہنچ گئی ہے۔ ان میں سابقہ حکومت کے وزیرِ اعظم، وزرائے مملکت، بڑے بڑے جرنیل، فوجی افسر، قومی اسمبلی کے سپیکر، پولیس کے آفیسرز وغیرہ شامل ہیں۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق :-

> ان اکیس افراد پر (جنہیں ۸ مئی کو گولی سے اڑا دیا گیا) ایک الزام یہ بھی تھا کہ انہوں نے ایران کے مذہبی راہنما آقائے آیت اللہ الخمینی کے بارے میں توہین آمیز الفاظ استعمال کئے۔ یہ الفاظ اس وقت استعمال کئے گئے تھے جب آقائے خمینی پیرس میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔
>
> (نوائے وقت ۹ مئی ۱۹۷۹ء)

امام الخمینی اسے "اسلامی انقلاب" سے تعبیر کرتے ہیں جس کے تحفظ کے لئے انہوں نے فوج اور پولیس کے علاوہ خصوصی فوجی دستوں کی تشکیل کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ "اس انقلاب کو دوسرے ممالک میں بھی برآمد کریں گے"۔ (ایضاً)

(۰)

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ اس بات پر کیوں زور دیتے تھے کہ پاکستان میں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دی جائے گی۔ یعنی وہ ایسی اسلامی حکومت نہیں ہوگی جس میں

بالواسطہ یا بلاواسطہ اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہو۔ تشکیل پاکستان کے بعد میں نے اپنا فریضہ سمجھا کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی اس آواز کو (جو درحقیقت قرآن کی آواز ہے) عام کیا جائے کہ یہاں تھیاکریسی قائم نہیں ہوگی اور کبھی میرا وہ بھرم ہے جس کی وجہ سے میری اس قدر مخالفت ہو رہی ہے۔ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ سیاسی پارٹی سے، نہ میں عملی سیاست میں حصہ لیتا ہوں۔ میں قرآن کریم کی طرف سے عائد کردہ اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ قوم پر اس حقیقت کو واضح کروں کہ اس خطۂ زمین کو اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی حکومت قائم ہو تھیاکریسی قائم نہ ہو، کیونکہ تھیاکریسی اور اسلامی نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ میں اور میرے رفقاء اس حقیقت کو نہایت پُرامن طریق سے عام کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں کسی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جس قدر سامان و ذرائع کی ضرورت ہے ہمارے پاس ان کی بے حد کمی ہے۔ لیکن وہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم دین کی آواز بلند کرنے کے لئے اٹھو تو خدا کی کائناتی قوتیں تمہارا ساتھ دیں گی، کچھ اسی کا اثر معلوم ہوتا ہے کہ سامان و ذرائع کی اس قدر کمی کے باوجود قرآن کی آواز جس تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ آپ ذرا دس بیس برس اُدھر کا نقشہ سامنے لائیے اور پھر آج کی فضا پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ یہ آواز کس طرح خاموشی ہی خاموشی سے ہر گوشے کو متاثر کئے جا رہی ہے، اور یہ حقیقت کس طرح ایک واقعہ بن کر سامنے آرہی ہے کہ:-

حسن کے رازِ نہاں شرح و بیاں تک پہنچے — آنکھ سے دل میں گئے، دل سے زباں تک پہنچے
دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھ نے دل سے کہہ دی — بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

یہ بات کے چل نکلنے کا نتیجہ ہی تو ہے کہ جن حضرات کے مواعظ و خطبات و تقاریر میں مجھ سے بھی قرآن کا نام نہیں آتا تھا وہ اب قرآن مجید کی آیات اور دین کی اصطلاحات استعمال کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اب فضا انہی کا تقاضا کرتی ہے۔ واضح رہے کہ اس سے میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو رہا کہ یہ حضرات مذہب کو چھوڑ کر دین کی طرف آرہے ہیں۔ یہ قرآن، دین اور اس کے نظام کے الفاظ محض مصلحتاً استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ یہ نہ اپنے فرقہ وارانہ عقائد کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں اور نہ ہی اپنے اپنے فرقہ کے فقہی قوانین کو قرآنی قوانین سے بدلنے کے لئے آمادہ۔ ان کے نزدیک اسلامی حکومت سے مراد وہی تھیاکریٹک نظامِ حکومت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا اور جس کے خطرات سے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے قوم کو آگاہ کیا تھا۔ مجھے اس بات کی البتہ خوشی ہے کہ قرآن کریم کی یہ آواز پاکستان کی حدود سے آگے بڑھ کر مغربی ممالک تک بھی پہنچ گئی ہے۔ اور چونکہ وہ لوگ تھیاکریسی کے سانپ کے ڈسے ہوئے ہیں اس لئے اگر وہاں کسی خطہ میں اسلامی نظام کے قیام کا امکان ہوا تو وہ تھیاکریسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیں گے۔ میرے ایک رفیقِ محترم محمد اسلام صاحب نے طلوع اسلام کنونشن ۱۹۶۶ء میں اپنے ایک خطاب میں جس کا عنوان "ذکر و فکرِ پرویز" تھا مغربی مصنفین کی ان چند کتابوں کا ذکر کیا تھا جن میں میری قرآنی فکر اور تحریک کا نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کے بعد ہماری کوئی کنونشن منعقد نہیں ہوئی اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کی پیش کردہ تفصیل کو یہاں دہرا دیا جائے۔

"غالباً ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے۔ (PETER-SCHMID) نامی ایک جرمن اسکالر ہندو پاک کی سیاحت

کے لئے آیا اور پرویز صاحب سے بھی آکر ملا۔ بعد میں اس نے اپنے تاثرات اور افکار کو کتابی شکل میں مرتب کیا جس کا انگریزی ترجمہ (INDIA – MIRAGE & REALITY) کے نام سے شائع ہوا۔ جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا ہوا۔ اس نے پرویز صاحب سے اپنی ملاقات کا حال بڑے شگفتہ اور ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ جیسا کہ احباب کو معلوم ہے پرویز صاحب کے مکان میں ایک الگ کمرہ ہے جس میں وہ کام بھی کرتے ہیں اور وہیں ملنے والے آکر ملتے بھی ہیں۔ اسی کمرہ میں ان صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جس کے تاثرات انہوں نے ان الفاظ میں بیان کئے :۔

میں جب پچھلی مرتبہ پاکستان آیا تو ایک مذہبی شخصیت، پیر مانکی شریف (مرحوم) سے ملا تھا۔ اس دفعہ ایک اور مذہبی شخصیت سے ملاقات ہوئی جس کی تعلیم اور وسعتِ ظرف اسے بالکل مختلف زمرہ میں شامل کرتی ہے۔ قرآنک ریسرچ سینٹر جس کے سربراہ۔ جی۔ اے۔ پرویز ہیں۔ گلبرگ کے ایک مکان کی نچلی منزل میں واقع ہے۔ اسی گلبرگ میں جو فلم اسٹارز اور دیگر ارضی مخلوق کا مسکن ہے۔ ان کے کمرے میں کھانے پینے کے برتن اور ان کا کتب خانہ اور مسودات اس امر کی شہادت دیتے تھے کہ وہی کمرہ ان کا دفتر بھی ہے اور خواب گاہ بھی۔ اس مردِ بزرگ کے چہرے کی عمیق لکیریں اور اس کی نیند کی ترسی ہوئی آنکھیں۔ سادہ سی دھات کے فریم کا چشمہ اور سفید بال، اس حقیقت کے غماز تھے کہ وہ کس گہری سوچ میں ڈوبے رہتا ہے۔ ان سوچوں کی پیدا کردہ علمی اور فکری صلابت میں کچھ لوچ پیدا کرتی تھیں تو اس کی خواب آلود آنکھیں۔ اس کے نزدیک تقویٰ، ترکِ دنیا کا نام نہیں بلکہ اس دنیا کو صفاتِ خداوندی کا آئینہ دار بنا دینے کی بالارادہ کوشش کا نام ہے۔

عزیزانِ من! ذرا غور کیجئے کہ مغربی مفکرین کی نگاہیں کس قدر تیز ہوتی ہیں۔ پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ مجھے یاد ہی نہیں پڑتا کہ مجھے کسی رات بھی گہری نیند نصیب ہوئی ہو۔ جس شخص کا دماغ دن بھر گہری سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہے، اُسے گہری نیند آ کیسے سکتی ہے؟ پرویز صاحب نے اگر یہ نہ بتایا ہوتا تو ہمیں شاید ہی اس کا احساس ہوتا کہ ان کی آنکھیں گہری نیند کو ترسی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ مفکر پہلی نظر میں بھانپ لیتا ہے کہ اس شخص کی آنکھیں محرومِ خواب رہتی ہیں اور اس کی پیشانی کی لکیریں اس گرامو فون ریکارڈ کی لکیریں ہیں جن میں صدیوں کی یادداشتیں مستور ہیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی ملاقات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جس میں موضوعِ گفتگو بیشتر قرآن کے معاشی نظام اور کمیونزم کا تقابلی موازنہ تھا۔

۲۔ ہالینڈ کے مشہور مستشرق (DR. J. M. S. BALJON) نے ۱۹۶۱ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان ہے (MODERN MUSLIM KORAN INTERPRETATION) یعنی عصرِ جدید کے مسلم مفسرینِ قرآن۔ اس مقصد کے لئے اس نے برصغیر ہند و پاک سے تین مفسرین کا انتخاب کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) علامہ عنایت اللہ خان المشرقی (مرحوم) اور پرویز صاحب۔ کتاب میں اس نے مختلف موضوعات پر ان ہر سہ مشاہیر کے علمی فکری اور قرآنی افکار کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس سے اس

کتاب نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے۔ پرویز صاحب کی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ:-

پرویز صاحب کی شخصیت کے حقیقی جوہروں کو ان کی درخشندہ تحقیقات اور بلند پایہ علمی صلاحیتوں میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ مہدا فیض نے انہیں ان نوجوانوں کے لئے جن کا موجوں کے طلاطم میں گھرا ہوا سفینۂ حیات، مذہبی لنگر کی تلاش میں ہو، اعلیٰ صلاحیتوں کا استاد اور باپ کی طرح شفیق دوست بنایا ہے۔ ان کی صاف اور شفاف نگاہ پیش آمدہ مسائل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے اور ان کے متعلق ان کی بلا کاوش و تردد، صائب رائے اور آزادانہ فیصلے ان کے اطمینانِ قلب و شرحِ صدر کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کے اثر و نفوذ کا دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا جائے گا۔ (ص ۱۵)

کس قدر صحیح ہے رائے اس محقق کی کہ پرویز صاحب کا اصلی مقام ایک شفیق اور غمخوار باپ کا ہے۔ ہم انہیں یونہی "باباجی" نہیں کہتے۔!

۳- ڈاکٹر (FREELAND ABBOTT) امریکہ کی (TUFTS) یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ انہوں نے "اسلام اینڈ پاکستان" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی۔ اس میں انہوں نے فکرِ پرویز اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے متعلق بڑی تفصیل سے دادِ تحسین دینے کے بعد کہا ہے کہ:-

پرویز صاحب اس وقت پاکستان کے سب سے بڑے فعّال اسلامی ریفارمر ہیں۔

(صفحہ ۱۳۹)

یہ کتاب فکرِ پرویز کو دنیا کے دور دراز گوشوں تک متعارف کرانے کا موجب بن گئی ہے۔

۴- مستشرقینِ مغرب میں پروفیسر (E.I.J ROSENTHAL) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے (ISLAM IN THE MODERN NATIONAL STATE) کے عنوان سے ایک شہرۂ آفاق کتاب لکھی ہے جسے کیمبرج یونیورسٹی پریس نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اس میں انہوں نے پاکستان میں مختلف اسلامی تحریکوں کا وسیع جائزہ لیا اور پرویز صاحب اور ان کی تحریک کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے۔

۵- سنہ ۱۹۷۰ء میں عزیز احمد اور G.E VONGRUNEBAUM کی مشترکہ تصنیف (MUSLIM SELF STATEMENT IN INDIA & PAKISTAN) کے نام سے شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے سرسید (علیہ الرحمۃ) سے لے کر صدر ایوب خان تک کے دور کے مختلف فکری اور سیاسی راہ نمایانِ ملت کی اسلامی کاوشوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس میں ایک پورا باب پرویز صاحب کی فکر و تحریک کے لئے وقف ہے۔

عزیز احمد صاحب نے ایک اور کتاب (ISLAMIC MODERNISM IN INDIA AND PAKISTAN)

کے نام سے تصنیف کی جسے ۱۹۶۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا تھا۔ اس میں بھی پرویز صاحب کی فکر و تحریک کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۶۔ کچھ عرصہ ہوا (MC GILL) یونیورسٹی (کینیڈا) کی طرف سے (MISS SHEILA MC DONOUGH) نامی ایک طالبہ ڈاکٹریٹ کے لئے اپنی تھیسس کی غرض سے پاکستان آئی تھی۔ وہ کافی عرصہ یہاں رہی اور اس کے بعد (THE AUTHORITY OF THE PAST) کے عنوان سے اپنا تحقیقاتی مقالہ لکھا جسے امریکن اکاڈمی اوف ریلیجن نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ اس میں اس نے سرسیدؒ، اقبالؒ اور پرویز کو اپنی تحقیق کا موضوع قرار دیا ہے۔ مقالہ اگرچہ ایک طالب العلم کا ہے لیکن اس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کی یونیورسٹیاں فکرِ پرویز کو ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقاتی مقالات کا موضوع منتخب کر رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ (MC DONOUGH) نے (SOCIAL IMPORT OF PARWEZ' RELIGIOUS THOUGHTS) کے نام سے ایک اور تحقیقاتی مقالہ بھی شائع کیا ہے۔ وہ ابھی تک ہماری نظروں سے نہیں گذرا لیکن علمی حلقوں میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔

۷۔ سوئٹزرلینڈ کے ڈاکٹر (P. ROBERT A. BUTLER) پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ لاطینی سے وابستہ اور عیسائی مشنری حلقہ کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ فکرِ پرویز کے ساتھ ان کی وابستگی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ طلوعِ اسلام کا التزاماً مطالعہ کرتے ہیں اور پرویز صاحب کی کوئی کتاب ایسی نہیں جسے وہ، اس کے شائع ہونے کے ساتھ ہی حاصل نہ کر لیتے ہوں —— سالِ گذشتہ انہوں نے اپنے عرصۂ دراز کے مطالعہ کا ماحصل (IDEOLOGICAL-REVOLUTION THROUGH THE QURAN) کے نام سے ایک تحقیقاتی مقالہ کی شکل میں شائع کیا جس نے مشنری دوائر میں بالخصوص بڑی شہرت حاصل کی۔ اس مقالہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اب حال ہی میں اس کا فرانسیسی زبان میں ایڈیشن تیونس (مراکو) سے شائع ہوا ہے۔

میں نے ان چند ایک کتابوں کا ذکر مثال کے طور پر کیا ہے ورنہ خود ان کتابوں کے اندر متعدد دیگر کتابوں کے حوالے موجود ہیں جن میں فکرِ پرویز کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ حق کی آواز میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ فوارہ کی طرح اپنے زورِ دروں سے اوپر اٹھتی اور آگے بڑھتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ پرویز صاحب کی تمام کتابیں (بجز ایک) اُردو زبان میں ہیں اور ان کی پبلسٹی کا یہ عالم ہے کہ ماہنامہ طلوعِ اسلام کے سوا ان کا کہیں ذکر تک نہیں آتا۔ انہیں اخبارات اور مجلات میں تبصرہ کے لئے بھیجا جاتا ہے تو وہ کتابیں رکھ لیتے ہیں لیکن ان پہ (موافق نہ سہی مخالف ہی سہی) تبصرہ نہیں کرتے۔ اس کے باوجود آپ دیکھئے کہ

یورپ اور امریکہ کی فکر گاہوں میں فکرِ تحریکِ پرویز پر ریسرچ ہوتی ہے اور کتابیں اور مقالے شائع ہوتے ہیں۔"

میرے تحریری لٹریچر کے علاوہ اس فکر کی نشر و اشاعت کے لئے ایک اور ذریعہ ابلاغ بھی اختیار کیا گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ اور وہ ہے میرے ہفتہ واری درسِ قرآن، مختلف تقاریب پر خطابات، اور تقاریر کی بذریعہ (CASSETTS) نشر و اشاعت۔ ان دروس و خطابات وغیرہ کے "ماسٹر ٹیپ" ادارہ میں تیار کئے جاتے ہیں۔ پھر انہیں کیسٹس پر ریکارڈ کر کے عام کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ پاکستان کی مشہور بستیوں کے علاوہ یورپ اور امریکہ تک کے مراکز میں جاری ہے اور اس کے بڑے امید افزا نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

اس تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے کہیں سے کوئی مالی امداد نہیں ملتی۔ جو لوگ اس فکر کو اچھا سمجھتے ہیں وہ اپنے ہی ذرائع سے اپنے طور پر اس کی نشر و اشاعت کا انتظام کرتے ہیں۔ خود ادارۂ طلوعِ اسلام بھی اپنے ہی ذرائع سے اسے چلا رہا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ کسی مصلحت اندیشی، جذبۂ مفاد پرستی، تذبذب اور جھجک کے بغیر خالصتاً قرآن کی آواز کو بلند کئے چلا آ رہا ہے۔ حق و صداقت کی آواز کا گلا، مصلحت کوشیاں اور مفاد پرستیاں گھونٹتی ہیں اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس تحریک کا گلا ان مصلحتوں کی دسترس سے باہر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ ہم نے آج تک کیا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں حالات اس سے زیادہ کچھ کرنے کے متقاضی ہیں۔ یعنی اس میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کرنے کے۔ لیکن ہم اپنی قرآنی آزادی کی قیمت پر ان ذرائع کو حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ قرآن کی آواز کو اگر مصلحت بینی ملوّث کر دے تو میرے نزدیک یہ شرکِ جلی ہے اور عدالتِ خداوندی میں شرک سے زیادہ سنگین جرم کوئی نہیں۔ بارگاہِ خداوندی سے میری استدعا بھی یہی ہے کہ وہ مجھے اس کی توفیق عطا فرمائے کہ جس طرح میں نے اور میرے رفقاء نے اس تحریک کو ابھی تک شرک سے آلودہ نہیں ہونے دیا اسی طرح اس کے بعد بھی یہ پاک اور صاف رہے۔

(۰)

آخر میں، میں اپنے رفقاءِ سفر کی خدمت میں بالخصوص دو ایک گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ احباب نے اس وقت تک میرے پروگرام کی تکمیل کے لئے جس مخلصانہ رفاقت کا ثبوت دیا ہے، اس کا گہرا نقش میرے دل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ جیسے رفقاءِ سفر ہر رہروِ حیات کے نصیب کرے۔ بعض اوقات مجھ سے کہا جاتا ہے کہ ہم اتنے عرصے سے اس آواز کو بلند کر رہے ہیں لیکن لوگ اس طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسری جماعتوں کو دیکھئے تو ان کے پیچھے لاکھوں افراد نظر آتے ہیں۔ اس کا تفصیلی جواب میں اپنے اس خطاب میں دے چکا ہوں، جو میں نے یومِ پاکستان کی تقریب منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء پر پیش کیا تھا اور جس کا عنوان تھا..... "بھولے ہوئے افسانے"..... اس میں میں نے بتایا تھا کہ ایک انقلابی کی راہ ان لوگوں کی راہ سے

کس قدر مختلف اور دشوار گذار ہوتی ہے جو عوام کے عقائد اور رسوم و مناسک کی تائید کے لئے اٹھتے ہوں۔ بالفاظِ دیگر دین کی طرف دعوت دینے والے کی راہ مذہب کے مبلّغوں کی راہ سے بالکل مختلف اور صعوبت انگیز ہوتی ہے۔ آپ احباب کی آگہی کے لئے میں ان الفاظ کو دہراتا ہوں جو میں نے ۱۹۶۲ء کی کنونشن میں کہے تھے۔ انہیں غور سے سنیئے اور دلیلِ راہ بنا لیجئے۔

"یہ ٹھیک ہے، ہماری برسوں کی تگ و تاز سے، گنتی کے افراد ہمارے شریک سفر ہوئے ہیں، اور مذہب پرست طبقہ کی ایک آواز پر لاکھوں افراد ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس کی بین وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہیں اور آپ اس کے چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں۔ وہ لوگ عوام کو انہی باتوں کی دعوت دیتے ہیں جنہیں وہ پہلے سے مان رہے ہیں، اور آپ انہیں ان راستوں پر چلنے سے روکتے ہیں جن پر وہ صدیوں سے آنکھیں بند کر کے چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ بنی اسرائیل کی طرف خدا کے دو جلیل القدر نبی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ مبعوث ہوتے ہیں۔ وہ برسوں تک ان کی تعلیم و تربیت میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ صرف اس قدر نکلتا ہے کہ۔ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ (۱۰/۸۳) ان پر قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔

گئوسالہ سامری

اس کے برعکس سامری انہیں ایک بت تراش کر دیتا ہے اور ساری قوم اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ اس میں سامری کی کاریگری اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اس نے قوم کی نفسیات کا مطالعہ کیا اور گئوسالہ پرستی کے جو جذبات ان کے دل کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود تھے، ان کی تسکین کا سامان فراہم کر دیا۔ یہی ہر زمانے کا سامری کرتا ہے۔ وہ قوم کی خوئے بت پرستی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کے ذوقِ عبودیت کی تسکین کے لئے ایک نیا بت تراش کر دے دیتا ہے۔ اور خود اس بت کدہ کا پجاری (مہنت) بن جاتا ہے۔ وہ اس بت تراشی میں بھی ایک پائی اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتا۔ وہ قوم ہی کے زیوروں کو ڈھال کر انہیں ایک بت بنا کر دے دیتا ہے۔ جب تک قوم میں خوئے بت پرستی موجود ہے، کسی بت ساز کو بھی پجاریوں کی کمی کی شکایت نہیں ہو سکتی۔ ہر بتکدہ آباد ہوگا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جس بت خانے کا مہنت زیادہ شاطر اور چالاک ہوگا اس میں چڑھاوا زیادہ چڑھے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں پہلے سے اس قدر خانقاہوں، درگاہوں اور مقبروں کی موجودگی کے باوجود ہر نئی قبر پر کس دھوم دھام سے میلہ لگتا ہے۔ اس میلے کی رونق کا راز، اس قبر کی جاذبیت میں نہیں، بلکہ قوم کی خوئے بت پرستی میں مضمر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص قوم کے دل سے بت پرستی کے جذبات نکالنا چاہتا ہے اس کی منزل بڑی کٹھن اور اس کے راستے بڑے پُر خار ہوتے ہیں۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کشمکش ہے جس میں صاحبِ ضربِ کلیمؑ کا ساتھ تو قوم کے چند افراد دیتے ہیں اور سامری کے پیچھے ساری قوم لگ جاتی ہے۔ یہی چار ہزار سال پیشتر ہوتا تھا اور یہی آج ہو رہا ہے۔ اس لئے برادرانِ من! آپ نہ تو

اپنی دعوت کے نتائج کی سست رَوی سے گھبرائیے اور نہ ہی سامریانِ عصرِ حاضر کی کامیابی کو ان کے مسلک کی صداقت کی علامت سمجھئے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ آپ کی دعوت، اس پیغام کی نقیب ہے یا نہیں جسے خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اسے قدم قدم پر جانچتے رہیئے۔ اور اس کی خاص احتیاط برتئے کہ اس دعوت کی کامیابی کے لئے کوئی طریق ایسا اختیار نہ کیا جائے جو ضابطۂ خداوندی کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو۔ یاد رکھئے! اس تحریک کی کامیابی کے لئے اگر آپ کا ایک قدم بھی غلط اُٹھ گیا تو وہی آپ کی شکست اور ناکامی کا مقام ہوگا۔ اور اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس راستے میں سب سے زیادہ گراں بہا متاعِ سفر اور محکم ترین سامانِ حفاظت، آپ کی سیرت کی بلندی اور کیریکٹر کی پختگی ہے۔ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز، آپ کی اپنی ذات کے ساتھ دیانت اور دوسروں کے ساتھ حسنِ معاملہ میں پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر یہ جوہر پیدا کر لئے تو پھر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی کہ ؎

جہادِ زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

(۰)

(جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے، پرویز صاحب نے یہ خطاب طلوعِ اسلام کنونشن بابت ۱۹۶۳ء میں پیش کیا تھا۔ اب جو اسے دوبارہ شائع کرنے کی تجویز ہوئی تو انہوں نے اس پر اس انداز سے نظرِ ثانی کی ہے کہ اسے حالاتِ حاضرہ تک لے آئے ہیں۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیئے۔)

دِین

اپنی مکمّل، عملی شکل میں عہدِ فاروقیؓ میں قائم ہوا۔
اس کے کچھ عرصہ بعد یہ مذہب میں بدل گیا۔
دِین کی وہ شکل کیا تھی اور یہ مذہب میں کیسے تبدیل ہوگیا؟ اس کی تفصیل پرویز صاحب کی مایۂ ناز کتاب

شاہکارِ رسالتؐ

میں ملے گی۔
قیمت مجلد -/۴۵ روپے ——— (علاوہ محصولڈاک) ملنے کا پتہ

(۱) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابتک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے

(۴) کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

نبیٔ اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت اُمت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مقسم صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقۂ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

(۰)

بقیہ:- سونے کے زیورات کی شرعی حیثیت (صفحہ ۱۶ سے آگے)

اس نکتہ نگاہ سے دیکھئے تو غریب یا متوسط طبقہ کی عورتیں اپنے زیورات کو اپنا معاشی سہارا سمجھتی ہیں اور معیشت کے موجودہ باطل نظام میں وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب بھی ہیں۔ لیکن ان سہاروں کی ضرورت معاشرے کے نچلے طبقے ہی کو ہے۔ اوپر کے طبقہ کی عورتوں کے لئے زیورات زیبائش کا ذریعہ اور دولت کی نمود کا موجب ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو چاندی اور (بالخصوص) سونے کی جس قدر مقدار زیورات کی شکل میں منجمد ہوتی ہے اس کی اقتصادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھئے تو قرآن کریم نے "چاندی سونے کے اکتناز" کو جو جہنم کے عذاب کا موجب بتایا ہے۔ (۹/۳۴)۔ تو ان میں یہ زیورات بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ اکتناز شدہ چاندی اور سونا "دولت" کی تعریف میں نہیں آسکتا کیونکہ دولت کے تو بنیادی معنی گردش کرنے والی چیزوں کے ہیں۔ جب دولت کسی مقام پر آکر رک جاتی ہے (یعنی جامد ہو جاتی ہے) تو وہ نارِ جہنم کا ایندھن بن جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس جامد سونے اور چاندی کو "دولت" میں تبدیل کس طرح کیا جائے؟ یعنی انہیں گردش میں کیسے لایا جائے۔ جہاں تک اس طبقے کا تعلق ہے جن کے لئے یہ تھوڑے بہت زیورات بُرے وقت کے سہارے کے لئے رکھے ہوتے ہیں تو جب تک ملک میں ایسا معاشی نظام قائم نہ کر دیا جائے جس میں کسی کو سہارے کی ضرورت نہ پڑے ـــــ یعنی کوئی کسی کا محتاج نہ رہے ـــــ اس وقت تک نہ یہ غریب طبقہ اپنی اس پونجی کو بطیب خاطر چھوڑنے کے لئے تیار ہوگا اور نہ ہی اسے ان سے زبردستی چھیننا تقاضائے عدل و انصاف ہوگا۔ یہ ان پر سراسر ظلم ہوگا۔

جہاں تک ان بیگمات کا تعلق ہے جو اپنے تمول کی نمود یا منافست (ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے جذبہ) کی خاطر زیور کے انبار لگائے رکھتی ہیں، تو ان کا معاملہ مختلف ہے۔ قرآن کریم نے ہوسِ نمود کی وجہ سے پاگل ہو جانے والوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ ہر وقت اس طرح کرب اور اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں گویا انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو۔ یہ بیگمات بھی جذباتِ نمود و منافست سے اس قدر مغلوب ہوتی ہیں کہ عقل و فکر کی بنا پر کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی آپ نے ان کی زبانی اکثر اس قسم کی باتیں سنی ہوں گی کہ "میں نے یہ زیور کوئی دو ماہ پہلے دس ہزار روپے میں بنوایا تھا۔ اب اس کا فیشن بدل گیا ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کے بدلے میں نئے ڈیزائن کا زیور لے لوں تو اسی جیولر نے جس سے یہ بنوایا تھا اس کی قیمت خرید چھ ہزار روپیہ لگائی ہے"۔ ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے اور اس کے باوجود یہ بدستور جیولروں کی دوکانوں کے چکر کاٹتی رہتی اور دولت ضائع کرتی رہتی ہیں۔

پھر مجھے لے چلا وہیں، دیکھو دلِ حنا نہ خراب کی باتیں

قرآنِ کریم نے عہدِ جاہلیت کی عورت کے متعلق کہا تھا: اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَهُوَ

فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ (۴۳:۱۸) "زیورات میں پلنے پوسنے کی وجہ سے وہ اس طرح سطحی جذبات سے مغلوب ہوتی ہے کہ خود اپنی بات بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی"۔ ضمناً۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا ہے' تو یہ بات یوں نہیں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ جس عورت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ، اپنے گھر میں کسی اختلافی معاملہ میں خود اپنی بات بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی اسے اگر کچہری میں لا کھڑا کیا جائے تو وہ بُری طرح بدحواس ہو جائے گی۔ اس کے ازالے کی صورت یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس کی کسی ایسی سہیلی کو کھڑا کر دیا جائے جو متنازع فیہ معاملے سے واقف ہو اور اگر گواہی دینے والی عورت کو کہیں الجھن پیدا ہو جائے تو یہ اسے لقمہ دے سکے۔

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ زیورات کو اپنے جذبات کی تسکین کے لئے رکھنے والی بیگمات کو دلائل و براہین کی رو سے اس پر آمادہ کرنا کہ وہ زیورات کو الگ کر دیں بہت مشکل ہے۔ یہی وہ مشکل تھی جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ جیسا دانشور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش　　مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ　　آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

(ضرب کلیم)

چاندی اور سونے کے جامد ٹکڑوں کو (خواہ وہ کسی شکل میں ہوں) اسی صورت میں دولت (گردش کرنے والی چیز) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے کہ ہماری بچیوں کی شروع سے صحیح تعلیم و تربیت ہو۔ اور ملک میں قرآن کا معاشی نظام نافذ ہو۔ اس نظام میں نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے نہ کوئی روٹی کے لئے کسی کا محتاج ہوتا ہے۔ اس نظام میں شاید دھاتوں کے ٹکڑوں (سونے چاندی) یا سنگ ریزوں (جواہرات) کی اضافی قیمت (RELATIVE VALUE) مقرر کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ دنیا کو ایک نہ ایک دن اس طرف آنا پڑے گا۔

رشتوں کی ضرورت

ایک نہایت شریف خاندان کی دراز قد، خوش شکل۔ ۲۷ سالہ دوشیزہ کے لئے — جو (B.Sc., B.Ed.) پنجاب سے ہے اور بصیغۂ ملازمت لیڈی گرفن ریلوے گرلز ہائی سکول لاہور میں سائنس ٹیچر ہے۔

موزوں (بارو زگار) رشتہ مطلوب ہے

— خط و کتابت —

و۔ا۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام
۲۵۔بی گلبرگ ۲۔ لاہور

ایک شریف گھرانے کی ۲۴ سالہ دوشیزہ کے لئے (بارو زگار) رشتہ مطلوب ہے۔
لڑکا تعلیم یافتہ و نیک سیرت ہو۔

— خط و کتابت —

و۔ب۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام
۲۵۔بی گلبرگ ۲۔ لاہور

مصنف کی دیگر شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۳۰ روپے
مکمل سیٹ -/۱۲۰ روپے

تبویب القرآن

آپ کے ذہن میں کوئی سوال کھٹکے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید میں کیا اور کہاں کہاں آیا ہے، تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

اس کتاب میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت ان قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ کہا گیا ہے۔ مصنف کی چالیس سالہ تحقیق کا ماحصل ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے عمدہ سفید کاغذ، اوفسٹ کی چھپائی، تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ قیمت:- مکمل سیٹ -/۱۶۰ روپے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکر قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۴۰ روپے
مکمل سیٹ مجلد -/۱۲۰ روپے

مطالب الفرقان

پرویز صاحب کے درس قرآن مجید کا سلسلہ گزشتہ بیس سال سے جاری ہے۔ اس میں ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت کے محاورۂ عرب اور تصریف آیات قرآنی سے آیات قرآنی کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مسلسل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا نام مطالب الفرقان ہے ابھی تک اس کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔
عمدہ سفید کاغذ، پاکیزہ اوفسٹ چھپائی۔
قیمت:- جلد اول -/۴۰ روپے، جلد دوم -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوع اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ) ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

149 SUTTON COURT RD.
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون 880800)
۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۲ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز
(فون 30890) عقب اڈہ لاریاں (رام دی جھگی)

کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۲ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز (بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ باڑہ روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خان۔ نواب علی روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶۔ لیاقت روڈ۔

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون 72071)

لیہ میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب۔ رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب۔ نہر کلرروڈ (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجّہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقات کار حسب ذیل ہیں:۔
ہر روز علاوہ جمعہ:۔ شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:۔ صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کرکے منگوائی بھی جاسکتی ہیں۔

محمد اسلم۔ کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ - ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ - نیو چالی۔ کراچی ۲